بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

احسان نہیں عدل چاہئے !

جن لوگوں نے تحریکِ پاکستان کی تاریخ کا مطالعہ، خالی الذہن ہو کر، بدقتِ نظر کیا ہے وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ پاکستان کو اتنا نقصان انگریز اور ہندو نے نہیں پہنچایا جتنا مسلمان قومیت پرستوں نے پہنچایا تھا۔ پاکستان کا مطالبہ، اسلام کی اس بنیادی حقیقت پر تھا کہ قرآن کی رُو سے قومیت کی اساس، اشتراکِ وطن نہیں بلکہ آئیڈیالوجی (دین) کا اشتراک ہے۔ انگریز یا ہندو، مطالبۂ پاکستان کی مخالفت، سیاسی وجوہات پر کر سکتے تھے۔ انہیں یہ کہنے کا حق نہیں پہنچتا تھا کہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد آئیڈیالوجی کا اشتراک ہے، ان کے دین کی رُو سے غلط ہے، گاندھی جی نے جب کبھی یہ کہنے کی کوشش کی کہ مذہب، خدا اور بندے کے درمیان نجی معاملہ ہے، اسے سیاست کے میدان میں نہیں لانا چاہئے تو قائداعظمؒ نے انہیں فوراً ٹوک دیا اور برملا کہہ دیا کہ آپ ہندومت کے متعلق جو جی میں آئے کہہ سکتے ہیں، اسلام کے متعلق کسی قسم کے فتویٰ دینے کا حق آپ کو حاصل نہیں۔ لیکن اس میدان میں مسلمان نیشنلسٹ آگے بڑھے اور جو بات انگریز اور ہندو کہنا چاہتے تھے، لیکن نہیں کہہ سکتے تھے، وہ بات انہوں نے کہنی شروع کی اور آخر تک کہتے رہے۔ یعنی یہ کہ اسلام میں قومیت کا مدار، وطن کا اشتراک ہے نہ کہ دین کا اشتراک۔ مسلمان قومیت پرستوں کا یہی اندازِ مخالفت تھا جس کی وجہ سے پاکستان کی جنگ اتنا طول کھینچ گئی اور بالآخر جب پاکستان ملا بھی تو اس انداز سے کہ اس کے وہ اجزاء جو اس کا (ہر لحاظ سے) لاینفک حصہ تھے، بھارت کے ساتھ ملا دیئے گئے۔ اور یوں اس کی وحدت ٹکڑوں میں بٹ گئی۔۔ یہ پانی کے جھگڑے، کشمیر کا تنازعہ اور اسی قسم کے دیگر مسائل اسی غلط بٹوارے کا نتیجہ ہیں جس کی بنیادی ذمہ داری مسلمان قومیت پرستوں کے سر پر عائد ہوتی ہے۔

ملک تقسیم ہوگیا۔ پاکستان وجود میں آ گیا۔قومیت کے مدار کا مسئلہ بھی طے ہوگیا۔لیکن ان قومیت پرستوں کا ابھی تک یہ عالم ہے کہ یہ کسی نہ کسی بہانے' قومیت کے سوال کو نت نئے دن اچھالتے رہتے ہیں۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تشکیل پاکستان سے ان لوگوں کو جو شکست فاش ملی' اس کے زخم ابھی تک ان کے دل سے مندمل نہیں ہوئے۔ان کی دلی آرزو یہی ہے کہ کسی طرح بھارت اور پاکستان کی تقسیم ختم ہو جائے اور (خدانہ کردہ) دونوں ملک مل کر پھر ایک ہو جائیں تا کہ وہ تحریکِ پاکستان کے حامیوں سے (فاتحانانہ انداز میں) کہہ سکیں کہ۔۔۔کیوں؟ ہم نہ کہتے تھے!۔

پاکستان کے مسلمان اگر تحریکِ پاکستان کے دوران اپنے مطالبہ پر اس لئے جمے ہوئے تھے کہ ان کے نزدیک وہ مطالبہ' خود اسلام کا تقاضا تھا تو تقسیم ہند کے بعد جو کچھ ہندوستان میں ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں پر بیت رہی ہے اسے دیکھتے ہوئے وہ بحضور رب العزت قدم قدم پر سجدہ کناں ہیں کہ اس نے انہیں اس ذلت اور خواری کی زندگی سے نجات دلا کر' آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کے قابل بنا دیا ہے' اس لئے اب کوئی اس فریب نفس میں مبتلا نہ رہے کہ پاکستان کے مسلمانوں نے اسے محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ تقسیم ہند واقعی ایک غلطی تھی۔

ہم ہندوستان کے ارباب بست وکشاد کی خدمت میں بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آپ حضرات متحدہ قومیت کے حامیوں کے دھوکے میں رہ کر' دونوں ملکوں کے لئے کافی تباہیوں کا موجب بن چکے ہیں۔اگر آپ مزید تباہیوں سے بچنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ حقائق کا بنظرِ خویش مطالعہ اور ان کا مردانہ وار مقابلہ کریں اور وہ حقائق یہ ہیں کہ

(۱) پاکستان کا مطالبہ کوئی سیاسی ہتھکنڈہ نہیں تھا۔یہ اسلام کی اس بنیادی حقیقت پر مبنی تھا کہ قومیت کا مدار' اشتراک وطن نہیں بلکہ دین کا اشتراک ہے۔

(۲) اسلام ایک نظامِ زندگی ہے جو صرف ایک آزاد مملکت میں زندہ حقیقت بن کر سامنے آ سکتا ہے۔مملکتِ پاکستان کا وجود اس حقیقت کا مظہر ہے اس لئے مسلمانوں کا کسی ایسی مملکت میں رہنا جس میں وہ اپنا (قرآنی) نظام زندگی متشکل نہ کر سکیں' کسی صورت میں آزادی کی زندگی نہیں کہلا سکتا۔

(۳) اسلام امن وسلامتی کا دین ہے' اس لئے اس دین کے پیرو دنیا میں امن قائم کرنے کے ضامن ہیں نہ کہ بدامنی پھیلانے

کے۔لہٰذا مملکتِ پاکستان تمام اقوام سے صلح و آشتی کے ساتھ رہنے کی آرزومند ہے لیکن اگر (خدانکردہ) ایسا وقت آجائے کہ اس کی آزادی اور آبرومندانہ حیثیت معرضِ خطر میں ہو تو مسلمانانِ پاکستان اس خطہ زمین کے تحفظ کو اپنا قومی فریضہ نہیں بلکہ دینی فریضہ سمجھتے ہوئے اس مقصد بلند کی خاطر ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔

(۴) ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات دو برابر کی آزاد مملکتوں کے باہمی معاہدات کی رو سے استوار ہوں گے نہ کہ سطحی، جذباتی اور پرفریب اپیلوں سے۔اس باب میں ہم نہایت واضح الفاظ میں کہہ دینا چاہتے ہیں کہ تقسیم سے لے کر اس وقت تک ہندوستان کی طرف سے پاکستان کے ساتھ جو ناروا سلوک ہوتا رہا ہے، اہل پاکستان کے دل پر اس کا بڑا گہرا اثر ہے۔ یہ اثر اسی صورت میں زائل ہوسکتا ہے کہ ہندوستان آئندہ اپنے رویہ میں خوشگوار تبدیلی پیدا کرے۔ ہم احسان نہیں چاہتے صرف عدل چاہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقطۂ نگاہ

تنویر مفتی، سویڈن

حملۂ عراق۔۔اسلام پر یا.....

ان دنوں عراق پر امریکی و برطانوی فوجوں کی یلغار ہے۔اس کے ساتھ ساتھ مختلف ٹیلی ویژن اسٹیشنوں پر ایک اور سرد جنگ دیکھنے کو مل رہی ہے۔ بحث ومباحثہ میں دوگروپ خاصے نمایاں نظر آرہے ہیں۔ایک وہ جو امریکی و برطانوی حملہ کو اسلام پر حملہ کہہ رہا ہے اور کچھ ماہرین اس سے متفق نہیں اور اسے معاشی جنگ کہہ رہے ہیں۔ بقول ان کے یہ عیسائیت کی اسلام کے خلاف جنگ نہیں اور نہ ہی اس سے اسلام کو کوئی خطرہ ہے۔ ٹیلی فون پر اپنی آراء دینے والوں کی اسلام سے جذباتی وابستگی واضح نظر آتی ہے۔غرض یہ کہ ہم ابھی تک یہ فیصلہ ہی کر نہیں پا رہے کہ یہ جنگ اسلام کے خلاف ہے یا نہیں؟ دوسرے لفظوں میں پھر (فکری) بٹوارے سامنے آرہے ہیں۔

اس تمام بحث ومباحثہ میں جو دلائل دونوں اطراف سے آرہے ہیں وہ خاصے ناکافی ہیں۔ میری نظر میں ان دلائل سے جو بات نمایاں ہے وہ یہی ہے کہ ہمیں خود ہی معلوم نہیں کہ اسلام ہے کیا؟ پھر وہی سازش کامیاب نظر آرہی ہے کہ اسلام ایک مذہب ہے اور اس کا زندگی کے باقی امور سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام کو دین سے ''مذہب'' میں تبدیل کرنے کی سازش کامیابی سے مسلمان اور اسلام کے خلاف استعمال کی جارہی ہے۔

وہ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ جنگ اسلام کے خلاف نہیں ان سے سوال یہ ہے کہ ''وہ کون سی جنگ ہوگی جسے وہ اسلام کے خلاف جنگ کہیں گے؟''

اگر تو ہم اس انتظار میں ہیں کہ دشمن علی العلان کہیں کہ ہم اسلام کے خلاف ہیں اور اسے ختم کرنا چاہتے ہیں'' تو پھر شاید یہ کبھی بھی نہ ہو۔حقیقت یہ ہے کہ دونوں جارج بش اور ٹونی بلیئر گاہے بگاہے اسلام کے لئے اچھے جذبات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔عید پر مسلمانوں کو ''عید مبارک'' کہتے ہیں اور چیدہ چیدہ مسلمانوں کو رمضان میں افطاری کی دعوت دیتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ مغربی دنیا کو اسلام سے بہ حیثیت مذہب قطعی کوئی خطرہ نہیں۔مسلمان اور مسلمان ممالک نظامِ سرمایہ داری کے مفاد میں کام کرتے رہیں تو ان کی بلا سے کہ آپ جمعہ کو مسجد میں جاتے ہیں یا اتوار کو چرچ میں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب تک ایران، عراق، افغانستان وغیرہ سرمایہ دار کے لئے کام کرتے رہے تب تک دوست بھی رہے امداد بھی ملتی رہی۔عراق پر بھی موجودہ فوجی یلغار میں کویت، قطر، سعودی عرب اور بہت سے دوسرے ممالک کی مدد

سے عراق کو نیست و نابود کیا جا رہا ہے۔

دین اسلام ہے ایک نظام' ایک سسٹم جو سرمایہ داری نظام کی ضد ہے۔ سرمایہ داری نظام کی ریڑھ کی ہڈی ''سود'' ہے جسے اسلام نے اوائل میں ہی حرام قرار دے دیا۔ تمام مغربی سرمایہ داری نظام' سود پر چلتا ہے۔ جبکہ اسلام مساوات کا پیغام دیتا ہے۔ سب کو برابر کے حقوق اور ساتھ لے کر چلنے کی تلقین کرتا ہے۔ یہ سرمایہ دار کے لئے قابل قبول نہیں اور وہ ایسے ہر نظام کو مٹانے سے گریز نہیں کرتا چاہے اسے اس کی بڑی قیمت چکانی پڑے۔ یہی وجہ تھی جب سرمایہ داری نظام نے کمیونزم کو 70 سال میں نیچا دکھایا۔

مغربی سرمایہ دارانہ نظام اسلام کو بہ حیثیت دین' سسٹم نہ قبول کر سکتا ہے اور نہ اسے پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہے۔ عراق پر حملہ اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔

اگر ہم کچھ دیر کے لئے یہ فرض کر لیں یا صحیح سمجھ لیں جیسا کہ امریکی و برطانوی کہہ رہے ہیں کہ عراق پر ایک جابر حکمران بذریعہ طاقت قابض ہے اور وہاں ظلم و ستم کا دور دورہ ہے۔ لوگ ضروریات زندگی سے محروم ہیں لہٰذا ہم یعنی امریکی و برطانوی فوجیں عراقی عوام کو ان کے حقوق دلانے اور جابر حکمران سے آزادی دلانے آئے ہیں۔ تو شاید یہ کہہ دینے میں زیادہ مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ امریکی و برطانوی فوجیں عراق میں اسلامی نظام نافذ کرنے گئے! اسلام بہ حیثیت مذہب تو عراقیوں کے پاس پہلے تھا ہی' یعنی وہ نماز' روزہ' حج وغیرہ کے تو پابند ہیں لیکن اسلامی نظام سے محروم ہیں۔ لیکن یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ امریکی و برطانوی فوج کا اصل مقصد کچھ اور ہے۔

یہ سرمائے اور اس پر قابض رہنے کی ہی کوشش ہے جو کویت' قطر اور دوسرے اسلامی سرمایہ دار مغربی سرمایہ دار کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں' ان کے لئے اپنی امارت اور سرمائے میں زیادہ کشش ہے نہ کہ دوسرے مسلمانوں کے لئے۔

اب اسی زاویے سے ماضی میں حضور اکرم ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کی جنگوں کو دیکھیں۔ یہ جنگیں نظام اسلامی کے لئے لڑی جاتی تھیں لوگوں کے عقیدے بدلنے کے لئے نہیں۔ فتوحات کے بعد حکم یہ ہوتا تھا کہ کسی سے زبردستی اسلام قبول نہ کروایا جائے۔ مفتوح لوگوں کی عبادت گاہوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے' ان کے خداؤں کو برا بھلا نہ کہا جائے۔ ان جنگوں کا مقصد انسانوں کو جبر و ظلم سے نجات دلا کر انصاف و مساوات دلانا ہوتا تھا۔ وہ مذہبی جنگیں نہ تھیں کہ لوگوں کے مذہب تبدیل کئے جائیں۔ وہ دین کی جنگیں تھیں کہ دنیا میں پسے ہوئے لوگوں کو ایک دین یعنی ایک اچھا سسٹم دیا جائے۔ جہاں جہاں ان جنگوں میں مسلمانوں کی فتوحات ہوئیں وہاں کے لوگوں کو دین دیا گیا۔ اور اسی دین سے متاثر ہو کر لوگوں نے اسلام کو قبول کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی عقیدہ بھی۔

حضرت عمرؓ کے دور میں جب سلطنت پارسیہ (ایران) فتح ہوئی تو تہران کے گورنر کو حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا ''اس سے قبل جتنی جنگیں ہوئیں تم ایرانیوں نے بہ آسانی عربوں کو شکست دی لیکن اس جنگ میں کیا ہوا؟ تہران کے گورنر نے جو جواب دیا وہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ''ہم ایک طاقتور سلطنت ہیں اور ہر لحاظ سے ہمیشہ عربوں سے آگے رہے ہیں جب تک تم صرف عرب رہے تمہیں شکست دینا

مشکل نہ تھا۔ لیکن اب تمہارے پاس کتاب (قرآن) آ گئی ہے۔ اب تمہیں شکست نہیں دی جا سکتی۔ تمہیں شکست دینے کے لئے پہلے تمہارے سے تمہاری کتاب چھڑوانی ہوگی۔ (پرویز)

دوستو! تہران کے گورنر کے الفاظ پر کام اسی دن سے شروع ہو گیا تھا۔ قرآن جو اسلامی نظام کا دستور ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیا وہ آہستہ آہستہ سازشوں کے تحت مذہب میں بدلتا گیا۔ دستور کا مطلب و مفہوم آہستہ آہستہ صرف ''مقدس الفاظ'' بنتے چلے گئے جن کو چوم چاٹ، ماتھے سے لگا کر، سبز کپڑے میں لپیٹ طاق میں رکھ دیا گیا۔ صرف ''ثواب'' کمانے، نکاح و مرگ پر پڑھا جانے لگا یعنی ''مذہب'' بن گیا اور اس سے صرف اور صرف جذبات وابستہ ہو گئے۔ جو گاہے بگاہے مجروح ہوتے ہیں تو ہر طرف سے چیخ و پکار ہونے لگتی ہے۔ دشمن ضرب پہ ضرب لگائے چلا جاتا ہے مسلمان اسے روک نہیں سکتا۔ چیخ پکار، آنسو آہیں اور دعائیں، اور دعائیں۔ یا پھر فلاح، فلاحی تنظیمیں۔ امدادی تنظیمیں۔ افغانستان اور عراق پر حملہ کے بعد دیکھ لیں کہ بیسیوں تنظیمیں دن رات مدد مانگ رہی ہیں تا کہ وہ افغانی اور عراقی مسلمانوں کے زخموں کی مرہم پٹی کر سکیں۔ امت کے ممبران کو زخم لگنے سے بچا سکنے سے تو ہم معذور ہیں البتہ زخموں کی مرہم پٹی کے لئے ہر طرف ہاتھ پھیلائے بیٹھے ہیں۔ ان تنظیموں کے اشتہارات میں بھی زخمی بچے اور ٹوٹے ہوئے گھر دکھا کر جذباتی کیا جاتا ہے اور ''ثواب'' کا مژدہ سنایا جاتا ہے۔ یعنی ہم بنا تو کچھ نہیں سکے یا جو بنایا اس کی حفاظت بھی نہ کر سکیں، لیکن توڑ پھوڑ کے بعد اسکی مرمت کے لئے ہم فوری سرگرم عمل ہوتے ہیں۔

امت مسلمہ پر نظر دوڑائیے۔ 55، 56 جغرافیائی حصے ہیں۔ ان میں سے شاید کچھ کو امدادی تنظیمیں سمجھ لیں، باقی امداد لینے والے۔ اسلامی ریاستوں میں ہی، سکول، اسپتال اور دیگر امداد کے لئے عام لوگوں سے چندہ، ہدیہ یا زکوٰۃ کی شکل میں پیسہ اکٹھا کیا جاتا ہے۔ سالہا سال میں جو بنتا ہے اسے لٹیرے (اندر والے اور باہر والے) کسی نہ کسی بہانے آ کر لوٹ جاتے ہیں۔ اندر والے اپنے سرمایہ و مفاد کو قائم رکھنے کے لئے باہر کے لٹیروں کو دعوت و مدد دے رہے ہیں۔ تباہی کے بعد یہ دونوں لٹیرے مل بیٹھ کر اکٹھا لوٹیں گے اور دنیا کو دکھانے کے لئے کچھ اسی لوٹی ہوئی دولت سے امدادی کام بھی کیئے جائیں گے۔

اقتصادی و معاشی جنگ بھی اسلام کے خلاف ہی ہے اور مسلمانوں کو اندر اور باہر کے لٹیروں سے ایک طویل جنگ کرنی ہوگی تا کہ نظام اسلامی دنیا میں پھیلایا جا سکے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رفیع اللہ۔ایم۔اے

فِقہی اِصطلاحات

آپ صبح سے شام تک اس قسم کے الفاظ سنتے ہوں گے کہ۔۔ یہ فرض ہے' یہ واجب' یہ سنت ہے' یہ مستحب یا یہ حرام ہے' یہ مکروہ۔۔کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔اور ان میں فرق کیا؟ ہم نے یہ سوال اٹھایا اس لئے ہے کہ جب کسی بات کے متعلق یہ سن لیا جائے کہ (مثلاً) یہ فرض ہے یا واجب۔ یا ایسا کرنا سنت ہے' تو اس سے اس بات کے متعلق ایک خاص تصور ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے' اور ایسا نہ کرنے سے انسان یوں محسوس کرنے لگ جاتا ہے کہ اگر وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو گیا۔تو بھی (کم از کم) اس سے کوئی سنگین جرم سرزد ہو گیا ہے۔ جس سے اس کی روح پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

اس کی وضاحت کے لئے ہم قربانی کے مسئلہ کی مثال پیش کرتے ہیں۔اس بارے میں عامتہ الناس کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ قربانی کے واجب ہونے پر اجماع امت ہے۔یعنی امت مسلمہ کے تمام اہل علم یا کم از کم ان کی اکثریت کے نزدیک یہ ہر صاحب نصاب مسلمان پر واجب ہے کیونکہ سنت ہے اور سنت بھی موکدہ۔ اب ''سنت مؤکدہ'' کے الفاظ سن کر اس کی اہمیت بڑی نمایاں ہو جاتی ہے۔لیکن دیکھئے کہ ان تمام ائمہ کے نزدیک جن میں امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ حنبل شامل ہیں' قربانی کا شرعی حکم کیا ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ۔جلد ا صفحہ ۵۹۳)۔

فالاضحیۃ سنۃ عین موکدۃ یاب فاعلھا ولا یعاقب تارکھا۔

قربانی سنت عین مؤکدہ ہے' کرنے والا ثواب کا حقدار ہو گا اور نہ کرنے والے پر کوئی شرعی گرفت نہیں۔

یعنی اگر کوئی مسلمان ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ اس پر عمل کرے کیونکہ یہ سنت ہے لیکن کسی کو اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ایسا کرنے والے پر شریعت کی طرف سے کوئی مواخذہ ہو گا۔ اگر لوگوں کو ان فقہی اصطلاحات کا صحیح علم ہو' تو وہ ہر عمل کا صحیح مقام متعین کر سکتے ہیں۔اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ائمہ اربعہ نے جو فقہی اصطلاحات متعین کی ہیں' ان کا ترجمہ عوام تک پہنچا دیا جائے۔ یہ اصطلاحات فقہ کی مشہور کتاب 'الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد اول' کے آخر میں بڑی مناسب ترتیب سے دی گئی ہیں۔ہم وہاں سے ان کا ترجمہ کرتے ہیں۔

اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ اصطلاحات قرآن کی نہیں' فقہ کی ہیں۔قرآن میں تو اوامر اور نواہی ہیں۔یعنی کسی کام کے کرنے کا حکم یا اس سے باز رہنے کی تاکید۔اوامر کے سلسلہ میں فرض' واجب سنت' مستحب وغیرہ کی تفریق اور ان کے

لئے یہ اصطلاحات' ائمہ فقہ کی متعین کردہ ہیں۔اب ان اصطلاحات کا ترجمہ دیکھئے:

شافعی فقہ کی اصطلاحات

فرض اور واجب: شافعی مذہب میں واجب اور فرض کی اصطلاحات ایک ہی مفہوم رکھتی ہیں اور ان کا شرعی حکم یہ ہے کہ ان پر عمل کرنے والا ثواب کا مستحق ہوتا ہے اور جو انہیں ترک کردے اس پر شرعی سزا لازم ہوگی۔مثلاً فرض نماز کو پورا کرنے والا ثواب کا حقدار ہوگا اور اسے ترک کرنے والے کو جہنم کا عذاب دیا جائے گا۔اسی طرح تمام دوسرے فرائض میں بھی۔ ہاں بعض اوقات فرض اور واجب کی اصطلاحات میں فرق کیا جاتا ہے اور وہ عام طور پر حج کے احکام ہیں۔وہاں فرض سے وہ احکام مراد لئے جاتے ہیں جن کی عدم تعمیل کی وجہ سے حج باطل ہو جائے اور واجب وہ احکام ہیں کہ اگر رہ بھی جائیں تو فدیہ دینے سے ان کی تلافی ہو جاتی ہے۔

حرام: حرام وہ ہے جس کے ارتکاب پر مرتکب کو سزا دی جائے اور اس سے بچنے پر وہ مستحق ثواب ہوگا۔اور جب کوئی ایسا شخص جس کے لئے حرام سے ہر حالت میں بچنا لازمی ہے' اس میں پڑ جائے گا تو اسے جہنم کا عذاب ہوگا۔

مکروہ: مکروہ وہ ہے جس کا ترک کرنا فرض تو نہ ہو لیکن مستحسن ضرور ہو۔اس لئے جب کوئی مسلمان اس کا ارتکاب کرلے گا تو اسے عذاب تو کوئی نہیں ہوگا' ہاں جب اسے ترک کرے گا' تو ضرور ثواب کا مستحق ہوگا۔

سنت' مندوب' مستحب' تطوع۔۔ یہ تمام اصطلاحات شافعیہ کے نزدیک مترادف مفہوم رکھتی ہیں۔یعنی ان پر عمل کرنا تو مستحسن ہے لیکن لازمی اور فرض نہیں۔اس لئے ان پر عمل کرنے والا ثواب کا حقدار ہوگا۔لیکن اگر کوئی ان کو ترک کردے گا تو ان پر شریعت کی طرف سے کوئی پکڑ نہ ہوگی۔

شافعیہ کے نزدیک سنت کی دو قسمیں ہیں۔ایک سنت عین' جس پر ہر مومن انفرادی طور پر عمل کرے جیسا کہ فرائض' مثلاً نماز' روزہ انفرادی طور پر لازم ہوتے ہیں۔۔سنت کی دوسری قسم سنت کفایہ ہے۔اور وہ یہ ہے کہ جب جماعت میں سے کوئی ایک بھی اس پر عمل کرلے تو بقیہ سے وہ ساقط ہو جائے۔جیسا کہ جماعت میں سے ایک آدمی سلام کی ابتداء کرے' یا جب بہت سے کھانے والے ہوں تو ان میں سے ایک کھانے پر بسم اللہ پڑھ لے' یا بہت سے لوگوں کی موجودگی میں ایک آدمی کا چھینک کا جواب دینا۔پس ان تمام امور میں جب جماعت میں سے ایک آدمی کرلے گا تو تمام جماعت سے سنت کا مطالبہ دور ہو جائے گا۔لیکن ان میں سے ثواب کے لئے صرف وہی ایک مخصوص ہوگا۔اسی طرح واجب کی بھی دو قسمیں ہیں۔۔واجب عین' جو ہر شخص پر انفرادی طور پر لازم ہو جیسا کہ بیان ہو چکا ہے اور دوسرا واجب کفایہ۔اور وہ یہ ہے کہ جب جماعت میں سے کوئی ایک بھی اس پر عمل کرے' تو باقیوں سے ساقط ہو جائے۔جیسا کہ نماز جنازہ میں شرکت اور سلام کا جواب دینا وغیرہ۔

مالکی فقہ کی اصطلاحات

واجب: مالکیہ کے نزدیک واجب وہ ہے جس پر عمل کرنے سے ثواب ہو اور اسکے ترک کرنے پر سزا و عذاب ہو۔اسے فرض اور لازم بھی کہا جاتا ہے۔جیسا کہ فرض نمازیں۔ہاں حج کے احکام میں فرض اور واجب میں کچھ فرق کیا جاتا ہے۔فرض وہ شرعی حکم ہے جس کے ترک کرنے سے سرے سے حج ہی باطل ہو جائے اور واجب وہ ہے

جس کی کمی فدیہ دے کر پوری کی جا سکے۔

مالکیہ کے نزدیک بھی فرض کی دو قسمیں ہیں۔فرض عین وہ ہے جس کا ہر مکلّف مسلمان سے مطالبہ کیا جائے اور فرض کفایہ وہ ہے کہ جب کوئی ایک شخص بھی اس پر عمل کرے تو بقیہ لوگوں سے ساقط ہو جائے۔جیسا کہ نماز جنازہ اور میت کا کفن دفن وغیرہ۔

حرام: حرام یہ ہے کہ جس کے ارتکاب پر سزا ہو اور اس کا ترک کرنا مستحسن ہو۔ اس کے لئے دوسرے اصطلاحی نام' محظور' معصیت وغیرہ ہیں۔اس کی مثال شراب نوشی وغیرہ ہیں۔

سنت: سنت وہ ہے جس کی حضورﷺ نے فرمائش کی ہو اور پھر اس کی تاکید کی ہو اور اس کی بڑی قدر بیان کی ہو اور اسے پوری جماعت کے سامنے کیا ہو اور کوئی دلیل اس کے واجب ہونے پر دلالت نہ کرے۔ جب کوئی مسلمان اس پر عمل کرے گا تو وہ ثواب کا مستحق ہو گا اور جب اسے ترک کرے گا تو اسے کوئی پکڑ نہ ہو گی اور اس کی مثال وتر اور عیدین کی نماز ہے۔

مندوب: جسے حضورؐ نے کرنے کو تو کہا ہو لیکن زیادہ زور نہ دیا ہو اور معاملہ کو ہلکا سمجھا ہو۔ پس جب کوئی مسلمان اس پر عمل کرے گا تو اسے ثواب ملے گا اور جب کوئی ترک کرے گا تو اس سے شریعت میں کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔ جیسا کہ نماز ظہر کے پہلے کی چار رکعتیں وغیرہ۔

مکروہ: مکروہ وہ چیز ہے جس سے شارع علیہ السلام نے منع تو کیا ہو لیکن زیادہ زور نہ دیا ہو۔ پس جب کوئی اس میں پڑ جائے گا تو اسے شریعت کی طرف سے کوئی سزا تو نہ ہو گی۔ ہاں اسے خلاف اولیٰ کہیں گے۔ جیسے تبلیغ کے کام کو ترک کر دینا یا نماز عصر کے بعد نفل وغیرہ پڑھنا۔

مباح: یہ ہے کہ جس کا شارع علیہ السلام نے نہ تو کرنے کا مطالبہ کیا ہو اور نہ ہی اس سے منع کیا ہو پس ایک مکلّف مسلمان اس کے کرنے اور ترک کرنے میں مختار ہے۔

حنبلی فقہ کی اصطلاحات

فرض: ان کے نزدیک بھی فرض کی وہی تعریف ہے جو اوپر گذر چکی ہے۔۔حنابلہ فرض کو رکن بھی کہتے ہیں۔

واجب: یہ بھی فرض کی طرح ہے۔مگر حج میں فرض وہ ہے جس کے رہ جانے سے حج باطل ہو جائے اور واجب وہ ہے جس کے رہ جانے پر فدیہ دے کر اس کی تلافی کر لی جائے۔ اسی طرح نماز کے بعض اعمال میں واجب اور فرض میں کچھ فرق کیا جاتا ہے۔حنابلہ نے نماز کے کچھ واجبات گنائے ہیں۔ جن کے عمداً ترک کرنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے لیکن اگر بھول چوک سے کوئی کمی رہ جائے تو اسے سجدہ سہو کے ذریعہ پورا کر لیا جاتا ہے۔فرض میں یہ کمی سجدہ سہو سے پوری نہیں ہو سکتی بلکہ نماز ہی باطل ہو جاتی ہے۔ دوسرے ائمہ کی طرح ان کے نزدیک بھی فرض کی دو ہی قسمیں ہیں۔فرض عین اور فرض کفایہ۔ سنت' مندوب اور مستحب ان کے نزدیک مترادف اصطلاحیں ہیں۔ان تمام کا ایک ہی مفہوم ہے۔ان پر عمل کرنے سے ثواب ملے گا اور ترک کرنے پر کوئی گرفت نہیں ہو گی۔

حرام: وہ ہے جس کے ترک کرنے پر ثواب ہو اور اس کے ارتکاب پر سزا اور عقاب ہو۔

حلال: یہ حرام کی ضد ہے اور اس میں واجب' مندوب اور مکروہ سب شامل ہیں۔ پس واجب حلال کے ترک پر گنہگار بھی ہو گا اور سزا بھی ہو گی جبکہ دوسری حلال چیزوں کے کرنے یا ترک کرنے پر گنہگار نہ ہو گا۔

باطل: وہ ہے جس سے ذمہ پورا نہ ہو سکے۔ مثلاً جب نماز کے ارکان میں سے کوئی رکن کم ہو گیا تو نماز باطل ہو جائے گی اور وہ اس شخص کے ذمہ رہے گی یہاں تک کہ وہ اسے دوبارہ ادا نہ کر لے۔

صحیح: وہ ہے جس سے ذمہ داری پوری ہو۔

حنفی فقہ کی اصطلاحات

فرض: حنفیہ کے نزدیک فرض وہ ہے جو دلیل قطعی سے ثابت ہو اور اس میں کوئی شبہ نہ ہو جیسے کہ پانچ نمازیں اور زکوٰۃ اور روزہ اور حج اور اللہ تعالیٰ پر ایمان۔ فرض کا شرعی یہ حکم ہے کہ وہ اعتقادی اور عملی دونوں طرح سے لازم ہو۔ پس جب کوئی اس کا انکار کر دے وہ کافر ہو گا اور جب اسے ترک کرے گا یعنی صرف عمل نہ کرے گا تو وہ شخص فاسق شمار ہو گا۔

واجب: حنفیہ کے نزدیک یہ فرض سے کمتر درجہ میں ہے اور جو ایسی دلیل سے ثابت ہو جس میں شبہ ہو اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ یہ عملاً تو لازمی ہو اور اعتقاداً نہ ہو۔ اس کا منکر شبہ کی گنجائش کی وجہ سے کافر نہ ہو گا اور اس کا تارک فرض سے کمتر درجہ کا گنہگار ہو گا۔ کیونکہ جو فرائض کا تارک ہو گا اسے تو آگ کا عذاب دیا جائے گا لیکن جو واجب ترک کرے گا تو تحقیق یہ ہے کہ اسے آگ کا عذاب تو نہ ہو گا وہ صرف حضور ﷺ کی شفاعت سے محروم ہو گا۔

سنت: احناف کے نزدیک سنت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سنت مؤکدہ اور یہ بالکل واجب کے معنی میں ہے۔ پس اس کا ترک کرنے والا فرض سے کم درجہ کا گنہگار ہو گا اور جب یہ نماز میں سہواً رہ جائے تو سجدہ سہو سے اس کی تلافی ہو جائے گی' جیسا کہ واجب میں اور بعض واجب احکام' دوسرے واجب احکام سے زیادہ مؤکدہ ہے۔ مثلاً سجدۂ تلاوت صدقۂ فطر سے زیادہ واجب ہے اور ان دونوں کا وجوب ''قربانی'' سے زیادہ مؤکدہ ہے۔ دوسری قسم سنت غیر مؤکدہ ہے اور یہ مندوب اور مستحب ہے۔

حرام: حرام فرض کے مقابل ہے۔ اس کے مرتکب کو آگ کا عذاب ہو گا۔ اور بچنے والا مستحق ثواب ہوتا ہے۔

مکروہ تحریمی: مکروہ تحریمی یہ ہے جو حرام سے زیادہ قریب ہو اور وہ واجب اور سنت مؤکدہ کے مقابل ہو۔

مکروہ تنزیہی: مکروہ تنزیہی یہ ہے کہ جس کے ارتکاب پر کوئی شرعی مواخذہ نہ ہو اور اس پر عمل کرنے سے تھوڑا سا ثواب ہے اور یہ سنت غیر مؤکدہ کے مقابل ہے۔

(الفقہ علی المذاھب الاربعۃ۔ جلد اول' صفحہ ۶۱۵)۔

☆☆☆☆☆☆

طلوع اسلام:-

فقہ کی یہ اصطلاحات درحقیقت کسی زمانے کی اسلامی حکومت کے احکام و قوانین کی مختلف حیثیتوں کی نمائندہ تھیں۔ مثلاً آج بھی آپ دیکھئے۔ حکومت کی طرف سے نافذ کردہ احکام و قوانین کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں۔ ''بائیں طرف چلو'' بھی قانون ہے۔ اور ''حکومت کے خلاف بغاوت نہ کرو'' بھی قانون ہے۔ اسی طرح ''انکم ٹیکس ادا کرو'' بھی ایک حکم ہے اور ''وار فنڈ میں چندہ دو'' بھی ایک طرح کا حکم۔ ان کی نوعیتوں کا فرق بھی ظاہر ہے۔ کسی زمانے کی اسلامی حکومت میں احکام و قوانین کی نوعیت کے فرق کے لئے اس قسم کی فقہی اصطلاحات وجود میں آئی تھیں۔ اب وہ حکومتیں تو باقی نہیں رہیں لیکن یہ اصطلاحات بدستور چلی آ رہی ہیں۔ اب ان کا نفاذ مولوی صاحبان کے فتوے کی شکل میں ہوتا ہے جس کی عملی حیثیت کا ہر ایک کو علم ہے۔ وہ اپنے حکم یا فتویٰ کی خلاف ورزی کرنے والوں کو بس اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ کل قیامت کو دیکھنا' تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ لیکن جب یہی اصطلاحات' حکومت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ تھیں۔ ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کے مواخذہ کو قیامت پر ملتوی نہیں کیا جاتا تھا عدالت فوراً فیصلہ کر دیتی تھی۔

اب بھی جب اور جہاں اسلامی حکومت قائم ہو گی اس کے قوانین کی مختلف حیثیتیں ہوں گی اور ان کی تعبیر کے لئے لامحالہ قانونی اصطلاحات بھی ہوں گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ظالم پنپ نہیں سکتا

”ان کی تباھی پر نہ آسمان رویا‘ نہ زمین کی آنکھ نم آلود ھوئی“ ـــــ ﴿القرآن العظیم﴾

ـــــــــــ پرویز

قریب 35 سال پہلے کا ذکر ہے‘ اس موضوع پر پرویز صاحب کا ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس دوران میں دنیا میں ظلم بڑھتا چلا گیا اور آج اس بدنصیب کرۂ ارض کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں ظلم کا دور دورہ نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جس وسعت‘ شدت‘ گیرائی اور گہرائی سے یہ آج نوع انسان پر مسلط ہے تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ بنابریں ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں قرآن کریم کے حقائق اور اس کی تنبیہات و تنذیرات کو بار بار سامنے لایا جائے بالخصوص اپنی قوم کے سامنے جو قرآن کریم پر ایمان کی مدعی ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر اس مقالہ کو درج مجلّہ کیا جاتا ہے۔۔۔ طلوع اسلام

دو ذہنیتوں کا فرق قابل غور ہے۔

ایک شخص یہ سمجھتا ہے کہ اگر میں ایسا انتظام کر لوں کہ قانون کی گرفت میں نہ آ سکوں‘ یا اگر اس کی گرفت میں آ بھی جاؤں تو‘ اپنے اثر و رسوخ‘ سفارش‘ رشوت سے مواخذہ سے بچ جاؤں تو پھر مجھے کسی کی پرواہ نہیں‘ میں جس پر چاہوں‘ ظلم و زیادتی کروں جن طریقوں سے چاہوں اپنے مفاد حاصل کروں۔ جس قانون کی جی چاہے‘ خلاف ورزی کروں‘ جس قسم کی چاہوں دھاندلی مچاؤں‘ میں اپنے ہر مقصد میں کامیاب رہوں گا اور مجھے کسی قسم کا خوف و خطرہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح ایک قوم سوچتی ہے کہ اگر میں اپنے ہاں کافی قوت جمع کر لوں‘ تو پھر جس قوم کا جی چاہے گلا دبا دوں‘ جسے چاہوں اپنا غلام بنا لوں‘ جس پر چاہوں ظلم و استبداد کروں‘ ہر طرح کی کامیابیاں اور کامرانیاں میرے حصے میں آئیں گی۔ مجھے کسی سے کوئی ڈر اور خوف نہیں ہوگا۔

لیکن ایک اور شخص (یا قوم) ہے جسے ہر طرح کی قوت حاصل ہے۔ اس کا اثر و رسوخ بھی کافی ہے‘ دولت اور ذرائع کی بھی کمی نہیں‘ اسے دوسروں پر ظلم و زیادتی کرنے کے تمام مواقع حاصل ہیں۔ اسے جائز و ناجائز طریق سے مال و دولت حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ لوٹ کھسوٹ اور سلب و نہب کی کوئی باز پرس نہیں کر سکتا۔ غرضیکہ دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جو اس کا ہاتھ روک سکے یا گلا دبا سکے۔ اس کے گرد و پیش افراد (یا اقوام‘ دن دہاڑے ناانصافیاں کرتے اور (بظاہر) پھولتے پھلتے چلے جاتے ہیں لیکن اس کے سامنے زندگی کا ایک محکم نظریہ‘ ایک اٹل قانون حیات‘ ایک

غیر متبدل کلیہ ہے جس کی صداقت پر اسے یقین کامل ہے۔ یعنی یہ کہ۔

انه لا یفلح الظالمون (۶/۲۱)

یاد رکھو! ظلم کرنے والا کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ظالم کی کھیتی پروان نہیں چڑھ سکتی، وہ کبھی پنپ نہیں سکتا۔

اس نظریہ زندگی، اس قانون حیات، اس محکم کلیہ پر اس کا ایمان، ظلم و جور، استبداد کے ہر قسم کے ذرائع، اور مواقع کے باوجود اسے کبھی ظلم و جور پر آمادہ نہیں کرسکتا۔ لوگ اس سے کہتے ہیں کہ تم کس فریب میں مبتلا ہو، دیکھتے نہیں کہ لوٹ کھسوٹ کرنے والے کس طرح دن دونی رات چگنی ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے مواقع روز بروز نہیں آتے۔ لیکن وہ اس ترغیب وتحریص کے باوجود، کامیابی کے لئے کوئی ناجائز طریقہ اختیار نہیں کرتا اور اپنے ''ناصح مشفق'' سے

بہ خفیف تبسم کہہ دیتا ہے کہ جسے تم ان کی ترقی سمجھ رہے ہو۔ یہ سب ''جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری'' ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ

فقطع دابر القوم الذین ظلموا (۶/۴۵)

ظلم کرنے والی قوم کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

زندگی کا یہ قانون اٹل ہے کہ ھل یھلک الا القوم الظالمون (۶/۴۷) ظالم قوم کی تباہی یقینی ہے۔ وہ زندگی کی شادابیوں اور خوشگواریوں سے محروم رہ جاتی ہے۔

لعنة الله علی الظالمین (۷/۴۵)

اول الذکر ذہنیت کا نام ہے۔۔ خدا سے انکار۔۔ اسے کفر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی خدا کے ابدی قوانین کی صداقت سے انکار بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ زبان سے اس کا اقرار کرتی ہے یا نہیں۔۔ اور ثانی الذکر ذہنیت کو خدا پر ایمان کہتے ہیں اور اس قسم کا ایمان رکھنے والوں کو قرآن کی زبان میں مومن اور مسلم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

آیئے! ہم دیکھیں کہ ہمارا شمار کس گروہ میں ہوتا ہے۔

ظلم کسے کہتے ہیں؟

اس مقصد کے لئے سب سے پہلے، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ظلم کہتے کسے ہیں؟ اس کے معانی کیا ہیں اور مفہوم کیا؟

لفظ ظلم کے بنیادی معنی ''کمی کرنے'' کے ہیں۔ یعنی کسی کے حقوق وواجبات میں کمی کرنا۔ اسے وہ کچھ، اور اتنا نہ دینا جس کا وہ حقدار ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں ہر قسم کی ناانصافی، جور، استبداد، قانون کی خلافی ورزی اور سرکشی آجاتی ہے۔ لیکن امام راغب نے اس (لفظ) کی ایک ایسی تعریف (Definition) دی ہے جو اس کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ یعنی ظلم سے مراد ہے۔

کسی شے کا اس مقام پر نہ ہونا جس مقام پر اسے ہونا چاہئے۔

اسی سے لفظ ''ظلمت'' آتا ہے۔ جس کے معنی ہیں۔۔ جس مقام پر روشنی ہونی چاہئے تھی۔ وہاں روشنی کے بجائے تاریکی ہونا۔

یہ تو ہوئے اس کے لغوی معنی۔ لیکن قرآن کریم، اس کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو اس صراحت اور وضاحت سے سامنے لایا ہے کہ ان کی روشنی میں، اس جامع حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دشواری ہی نہیں رہتی کہ ظلم کسے کہتے ہیں۔ اور ظالم کون ہوتا ہے۔

شرک سب سے بڑا ظلم ہے

سب سے پہلے وہ ظلم کے ایک ایسے گوشے کو سامنے لاتا

ہے۔جس کی طرف کسی کی نگاہ ہی نہیں اٹھ سکتی تھی۔آپ نے کبھی کسی کو یہ کہتے نہیں سنا ہوگا کہ شرک' ظلم ہے اور مشرک' ظالم ہوتا ہے۔ لیکن قران کا اعلان ہے کہ شرک' ظلم ہی نہیں بلکہ ''ظلم عظیم'' ہے (۳۱/۱۳) یہ نکتہ غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔

قرآن کریم کی رو سے توحید (یعنی ایک خدا کو ماننے) سے مراد یہ ہے کہ انسان' صرف قوانین واحکام خداوندی کی اطاعت کرے۔اس کے سوا کسی اور کی اطاعت نہ کرے۔اگر اس نے' خدا کے علاوہ کسی اور کے احکام وقوانین کی اطاعت کی' تو اس نے گویا' اس شخص (یا قوت) کو اس اقتدار واختیار میں شریک کرلیا جو صرف خدا کے لئے مختص تھا۔اس سے یہ شخص (یا قوت) اس مقام پر نہ رہے جس مقام پر انہیں رہنا چاہئے تھا۔اس سے بڑا شرک اور کیا ہو گا؟

دوسری طرف اس انسان کو لیجئے جو شرک کا مرتکب ہوتا ہے۔خدا نے انسان کو کائنات میں سب سے بلند مقام عطا فرمایا ہے اس نے کہا ہے کہ۔۔۔وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعا منہ۔ (۴۵/۱۳) ''جو کچھ زمین و آسمان میں ہے' خدا نے اس سب کو تمہارے لئے تابع تسخیر کر دیا ہے'' یہ تو رہا خارجی کائنات کے متعلق۔باقی رہے دوسرے انسان' تو اس نے کہا ہے کہ۔۔ولقد کرمنا بنی ادم (۷۰/۱۷) ہم نے تمام انسانوں کو یکساں طور پر واجب التکریم پیدا کیا ہے۔اب اگر ایک انسان' خارجی کائنات کی کسی قوت کے سامنے جھکتا ہے تو یہ اپنے جیسے انسان کو اپنا حاکم قرار دیتا ہے۔اس کا یہ عمل' دونوں صورتوں میں شرف انسانیت کی تذلیل کا موجب ہے اس نے اپنے آپ کو اس مقام پر نہیں رکھا جس مقام پر انسان ہونے کی حیثیت سے اسے ہونا چاہئے اور یہ بہت بڑا ظلم ہے۔

شرک کی پہلی صورت اگر خدا کے خلاف شرک تھا تو دوسری صورت' خود انسان کی اپنی ذات کے خلاف شرک ہے اور یہ ''ظلم عظیم'' ہے۔

شرک (ظلم عظیم) کی اس شکل کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ ہم میں سے کتنے ہیں جو اس جرم کے مرتکب نہیں ہو رہے۔۔زندہ انسان تو ایک طرف ہماری ذلت کی انتہا ہے کہ ہم مردہ انسانوں تک کے حضور جھکتے اور گڑگڑاتے ہیں اور ہر سانس میں غیر خداوندی احکام وقوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔(یاد رکھئے! خدا کی عبادت کے معنی خدا کی اطاعت ہیں۔یعنی اس کے احکام و قوانین کی اطاعت کرنا)۔

یہاں تک تو شرک (یعنی ظلم عظیم) کی اس نوع کا ذکر تھا جس میں انسان کسی دوسرے کی محکومیت اختیار کرتا ہے۔لیکن قرآن کریم اس باب میں' ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر خدا کے احکام وقوانین کے خلاف تم اپنے جذبات وخواہشات کے پیچھے چلنے لگ جاؤ تو یہ بھی شرک ہے۔تمہارے جذبات کا صحیح مقام یہ ہے کہ ان سے' قوانین خداوندی کی روشنی میں کام لیا جائے' نہ یہ کہ انہیں اپنے آپ پر مسلط کرلیا جائے۔یہ بھی ظلم ہے۔قرآن کا ارشاد ہے۔

بل اتبع الذین ظلموا اھواء ھم بغیر علم (۳۰/۲۹)

یہ ظالم' وحی کی روشنی کے بغیر' اپنے جذبات کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔

بظاہر یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی کہ اتباع جذبات کو ظلم سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے۔لیکن بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سامنے آجائے

گی کہ ظلم وتعدی کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ انسان قوانین خداوندی کو چھوڑ کر اپنی من مانی کرنے لگ جائے۔ اسی کو ''اتباع جذبات بغیر علم'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو شخص اپنے جذبات وخواہشات کو وحی کے تابع رکھے اور یوں تمام معاملات کے فیصلے قوانین خداوندی کے مطابق کرے۔ اس سے ظلم سرزد ہو نہیں سکتا۔

ظالم حکومت

یہی چیز جب انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر انسانوں کی اجتماعی زندگی سے متعلق ہو جائے تو اس وقت یوں کہا جائے گا کہ عدل وانصاف پر مبنی حکومت وہی کہلا سکتی ہے جس میں تمام امور کے فیصلے قوانین خداوندی کے مطابق ہوں۔ جو نظام مملکت قوانین خداوندی کے مطابق قائم نہ ہو قرآن کریم اسے ظالم کہہ کر پکارتا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الظالمون۔ (۵/۴۵)

جو حکومت وحی خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتی تو یہی لوگ ہیں۔ جنہیں ظالم کہا جاتا ہے۔

منافقت

ایک انداز یہ بھی ہوتا ہے کہ جب دیکھا جائے کہ خدا کے کسی حکم یا قانون کے مطابق فیصلہ لینے میں فائدہ ہوتا ہے تو اس کی اطاعت اختیار کر لی جائے لیکن جو قانون اپنے خلاف جاتا ہو اس سے اعراض برتا جائے۔ قرآن کریم اس منافقانہ طرز زندگی کو بھی ظلم سے تعبیر کرتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ:

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی اطاعت بھی کرتے ہیں لیکن اس کے بعد ان کا ایک گروہ اس اطاعت سے روگردانی اختیار کر لیتا ہے۔ یہ درحقیقت مومن ہیں ہی نہیں۔

اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ جب انہیں اس نظام کی طرف بلایا جاتا ہے جسے خدا کے رسول نے احکام خداوندی نافذ کرنے کے لئے قائم کیا ہے۔ تاکہ وہ ان کے متنازعہ معاملات کا فیصلہ کرے تو وہ گروہ اس سے اعراض برتتا ہے لیکن اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا تو وہ اس کی اطاعت کے لئے لپک کر آتے ہیں..... اولئک ھم الظالمون۔ (۲۴/۴۷۔۵۰) یہ لوگ بھی ظالم ہیں۔

غلط نظریہ زندگی

اصل یہ ہے کہ اس قسم کا منافقانہ انداز اختیار ہی وہ کرتا ہے جسے صحیح نظریہ زندگی پر ایمان نہ ہو۔ نظریہ زندگی ہی (جسے قرآن کلمہ کہہ کر پکارتا ہے اور دور حاضرہ کی اصطلاح میں جسے آئیڈیالوجی کہا جاتا ہے) انسانی عمل کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار ہوتا ہے۔ غلط نظریہ زندگی کو نہ خود ثبات ہوتا ہے نہ ہی اس بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارت اعمال استوار ہو سکتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے غلط نظریہ زندگی کے حاملین کو بھی ظالم کہہ کر پکارا ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ہے۔

صحیح نظریہ زندگی کی مثال ایک ایسے عمدہ پھلدار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال میں محکم واستوار ہوں اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی میں جھولے جھول رہی ہوں۔ وہ درخت قانون خداوندی کے مطابق ہر زمانے میں ہر موسم میں پھل دیئے جاتا ہے۔ اس طرح اللہ بسیط

حقائق کو محسوس مثالوں کے ذریعے واضح کر دیتا ہے تا کہ لوگ انہیں اچھی طرح سمجھ جائیں۔

اس کے برعکس، غلط نظریہ زندگی کی مثال ایک ایسے نکمے درخت کی سی ہے جس کی کھوکھلی سی جڑ، زمین کے اوپر ہی اوپر ہو، کہ اسے جب جی چاہے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ اس طرح خدا، اس محکم نظریہ زندگی کی رو سے، ایمان والوں کی جماعت کو، ان کی دنیاوی زندگی میں بھی ثبات و تمکن عطا کر دیتا ہے اور اخروی زندگی میں بھی۔ اس کے برعکس غلط نظریہ زندگی کے حامل (ظالمین) کی تمام کوششیں رائیگاں جاتی ہیں اور یہ سب کچھ خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ (۲۷-۲۶/۱۴)

دو نظریاتِ حیات

ایک نظریہ زندگی یہ ہے کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم کا نام نہیں۔ اس میں ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ جسم کی پرورش اور آسائش اس لئے ضروری ہے کہ زندگی کی موجودہ سطح پر یہ اس کی ذات کا مرکب ہے اور اس کے فیصلوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ۔ زندگی کا حقیقی مقصود انسانی ذات کی نشوونما ہے اس لئے انسان جو کام بھی کرے اس میں دیکھنا یہ چاہئے کہ وہ کس حد تک اس کی ذات کی نشوونما کے لئے ممد و معاون ہو سکتا ہے جس عمل کا جذبہ محرکہ یہ ہوا سے ثبات و قرار ہوتا ہے کیونکہ وہ گویا اس کی ذات کا جزو بن جاتا ہے جو جسم کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی۔

اس کے برعکس دوسرا نظریہ یہ ہے کہ زندگی بس اسی جسم کی زندگی ہے۔ اس کے خاتمہ پر خود انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ زندگی کا حامل جو کچھ کرے گا، اس لئے کرے گا کہ اسے جسم کی پرورش و آسائش کا سامان ہاتھ آ جائے۔ اگر وہ کوئی ایسا کام بھی کرے گا جسے عام اصطلاح میں ''نیکی'' کہا جاتا ہے۔ تو اس کا جذبہ محرکہ اپنی نمود و نمائش ہوگا جس سے انسان کے ایغو کی تسکین ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے اعمال کے لئے بقا نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم نے اسے ''اپنی ذات پر ظلم'' سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے۔

> ایسے لوگوں کے پیش نظر صرف طبیعی زندگی کی آسائشیں ہوتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے جو کچھ صرف کیا جائے اس کی مثال ایسی ہے جیسے شدت کی سرد ہوا چلے اور ان لوگوں کی کھیتی تک جا پہنچے، جنہوں نے قانون خداوندی کے مطابق اس کی حفاظت کا سامان نہیں کر رکھا، تو یہ ہوا ان کی کھیتی کو تباہ کر دے گی۔ یہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کر رکھا تھا۔ یاد رکھو! خدا کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا، لوگ خود اپنے آپ پر ظلم اور زیادتی کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ (۳/۱۱۶)

غلط معاشی نظام

ظلم کا عام مفہوم یہ ہے کہ دوسروں کے واجبات پورے پورے ادا نہ کئے جائیں۔ ان کے حقوق کا اتلاف کیا جائے۔ دوسروں کا مال ناجائز طور پر کھا لیا جائے دوسروں کی محنت کی کمائی پر تن آسانی اور عیش سامانی کی زندگی بسر کی جائے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ یہ سب خرابیاں غلط معاشی نظام کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس لئے غلط معاشی نظام، بجائے خویش بہت بڑا ظلم ہے اور اس قسم کے نظام کے حامل، سب سے بڑے ظالم۔ قرآن کریم میں معاشیات کے

متعلق اس قدر وضاحت اور کثرت سے آیا ہے کہ ضمنی طور پر اس کا احاطہ ممکن نہیں۔ (میں اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں) اس لئے اس مقام پر اس کے صرف دو ایک گوشوں کو سامنے لایا جائے گا۔ مثلاً سورۂ النحل میں ہے۔

قوموں پر تباہیاں کیوں اور کب آتی ہیں' اسے ایک مثال سے سمجھو۔ ایک بستی تھی' جسے خارجی خطرات کی طرف سے امن اور داخلی کشمکش سے اطمینان حاصل تھا۔ اس کی طرف ہر سمت سے سامان رزق کھنچے چلا آتا تھا۔ اس کے رہنے والے بڑے خوشحال اور فارغ البال تھے۔ لیکن انہوں نے خدا کی ان بخشائشوں کی ناقدر شناسی کی۔ (بڑے بڑے لوگوں نے انہیں اپنے لئے سمیٹنا اور چھپانا شروع کر دیا۔) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری ہو گیا۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا ساختہ پرداختہ تھا۔

ان کے پاس خود انہی میں سے خدا کا ایک پیغامبر آیا۔ لیکن انہوں نے اسے جھٹلایا تو ان پر ہلاکت کا عذاب مسلط ہو گیا۔

اور یہ سب اس لئے ہوا کہ هم ظالمون وہ ظالم تھے۔ (۱۶/۱۱۲۔۱۱۳)

اسی قسم کی مثال اس نے سورۂ کہف (آیات ۳۲۔۴۳) میں بھی دی ہے اور تباہ ہونے والے کے متعلق کہا ہے کہ هـــــو ظالم لنفسه۔ اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا۔ جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کی شکل میں سامنے آیا۔

ننانویں دُنبیاں

غلط معاشی نظام کی ایک بنیادی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اس میں بڑا سرمایہ' چھوٹے سرمایہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ میں غریب' غریب تر اور امیر' امیر تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ظلم کی یہ وہ شق ہے۔ جسے قرآن کریم نے' حضرت داؤد علیہ السلام کے تذکرہ کے سلسلہ میں یوں بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ ان کے پاس دو شخص اپنا مقدمہ لے کر آئے۔

مستغیث نے کہا کہ فریق ثانی میرا بھائی ہے۔ اس کے پاس ننانویں دنبیاں ہیں اس لئے بڑا خوش حال ہے اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے جو میری معاش کا واحد سہارا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ یہ اپنے غریب بھائی کی کچھ مدد کرے۔ مجھ سے کہتا ہے کہ اپنی ایک دنبی بھی مجھے دیدے۔ چونکہ امیر آدمی ہے اور صاحب اثر' اس لئے باتوں میں مجھے دبا لیتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں اب آپ فیصلہ کیجئے کہ کیا اس کا یہ مطالبہ جائز ہے۔

داؤد نے کہا کہ اس شخص کا یہ مطالبہ سراسر ظلم اور زیادتی پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ جب بھی مل جل کر رہتے اور کاروبار میں باہمی شراکت کرتے ہیں تو ان میں سے اکثر کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں پر زیادتی کرتے رہتے ہیں۔ (۳۸/۲۳۔۲۴)

ربوٰ

بڑا سرمایہ دار دوسروں کی محنت کی کمائی کو کس طرح غصب کر لیتا ہے' اسے قرآن کریم نے ربوٰ سے تعبیر کیا ہے۔ ربوٰ کے معنی صرف سود نہیں۔ اس سے مراد ہے سرمایہ کا معاوضہ لینا خواہ وہ

کسی شکل میں ہو۔ قرآن کریم کی رو سے، معاوضہ صرف محنت کا ہو سکتا ہے۔ سرمایہ کا نہیں۔ سود بھی اسی لئے حرام ہے کہ اس میں معاوضہ، سرمایہ کا لیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے، اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کہ جس نے کسی کو کچھ سرمایہ دیا ہے، اسے صرف سرمایہ واپس لینے کا حق ہے۔ اس سے زائد کچھ نہیں۔ بڑا جامع فقرہ ارشاد فرمایا ہے جب کہا ہے کہ اس طرح سے

لاتظلمون ولا تظلمون (۲/۲۷۹)

لہٰذا محض سرمائے کے بدلے میں دوسروں کی محنت سے کچھ لے لینا ظلم ہے۔ موجودہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہی اس پر ہے۔

مترفین

جو لوگ خود محنت نہیں کرتے بلکہ (اپنے سرمایہ کے زور پر) دوسروں کی محنت کی کمائی غصب کر لیتے، اور اس طرح تن آسانی کی زندگی بسر کرتے ہیں، قرآن کریم انہیں مترفین کہہ کر پکارتا ہے۔ قرآن کریم نے ایسی قوم کا انجام کیا بتایا ہے جس میں اس قسم کا معاشی نظام رائج ہو، یہ غور سے دیکھنے کی چیز ہے۔ سورۂ انبیاء میں ہے۔

> ہم نے تم سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو تباہ کر دیا جنہوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی۔ وہ تباہ ہو گئیں اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔ ان کی غلط روش کے نتائج غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے جا رہے تھے اور ان سے کہا جا رہا تھا کہ تم اس روش کو چھوڑ دو، ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ لیکن انہوں نے ایک نہ مانی چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ وہ محسوس طور پر ان کے سامنے آ گئے، تو وہ انہیں دیکھ کر لگے بھاگنے۔

لیکن اس وقت وہ بھاگ کہاں سکتے تھے چنانچہ ہمارے قانون مکافات نے انہیں للکارا اور کہا کہ اب تم بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو۔ مت بھاگو اور الٹے پاؤں اپنی انہی عیش سامانیوں کی طرف چلو (ما اترفتم فیه) جنہیں تم نے دوسروں کی کمائی سے حاصل کر رکھا تھا۔ اور ان محلات کی طرف پلٹو جن میں تم اپنے آپ کو اس قدر محفوظ سمجھا کرتے تھے۔ وہاں چلو تا کہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ کس کی محنت سے بنا تھا اور تمہارا اس پر کیا حق تھا۔

اس وقت انہیں اس حقیقت کے اعتراف کے بغیر چارہ ہی نہ تھا کہ وہ واقعی ظالم تھے اور اپنے کئے پر سخت متاسف۔ لیکن اس وقت اس ندامت اور تاسف سے کیا ہو سکتا تھا۔ جب نتائج مرتب ہو کر سامنے آ جائیں تو پھر وہ پلٹا نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ برابر چلاتے رہے کہ جو زیادتیاں انہوں نے کی ہیں وہ ان پر بے حد متاسف ہیں۔ لیکن ہمارے قانون مکافات نے انہیں ایسے کر دیا جیسے کٹا ہوا کھیت، یا بجھا ہوا شعلہ (۱۵۔۱۱/۲۱)

ان تباہ ہونے والوں کے متعلق دوسرے مقام پر کہا ہے۔ کہ ان کا یہ حال تھا کہ یہ ظالم اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لے جاتے، تا کہ ان کی آسودگیوں اور تن آسانیوں میں فرق نہ آنے پائے، خواہ باقی انسانوں پر کچھ ہی کیوں نہ گزر رہے۔ یہ تھے ان کے وہ جرائم جن کی وجہ سے ان پر تباہی آئی تھی۔

یاد رکھو! خدا نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ کسی بستی کو یونہی اندھا

دھند ظلم وزیادتی سے تباہ کر دئے درآں حالیکہ وہاں کے رہنے والے اپنے اور دوسروں کے حالات کو سنوارنے والے ہوں۔(۱۱/۱۱۶-۱۱۷)

باطل

اسی کو قرآن کریم نے ''دوسروں کے مال کو باطل طریق سے کھا جانے'' سے تعبیر کیا ہے(۴/۲۹) اور کہا ہے کہ۔ ومن یفعل ذالک عدوانا و ظلما فسوف نصلیه فارا (۴/۳۰) یاد رکھو! جو معاشرہ ظلم وسرکشی سے ایسی روش اختیار کرے گا۔ وہ بہت جلد تباہیوں کی آگ میں جھلس کر رہ جائے گا۔ چونکہ اس قسم کا ظلم و جورا نہی لوگوں کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں۔ جن کا جتھہ یا پارٹی کوئی نہ ہو۔ اس لئے اسے خاص طور پر دہرایا گیا کہ

یاد رکھو! جو لوگ ظلم وزیادتی سے ایسے لوگوں کا مال کھا جاتے ہیں جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں۔ ان کے متعلق یوں سمجھو گویا وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں۔(۴/۱۱۱)

مذہبی پیشوائیت

یوں تو قرآن کریم میں ہر ناجائز طریقہ کو باطل کہا گیا ہے لیکن، حق کی ضد ہونے کی بناء پر اس سے مراد وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو بغیر کسی تعمیری کام کرنے کے، مفت میں بیٹھے دوسروں کی کمائی کھاتے رہیں۔ یعنی ایک تو وہ گروہ تھا جو اپنا سرمایہ لگا کر دوسروں کی محنت غصب کرتا تھا۔ لیکن یہ وہ گروہ ہے جو سرمایہ تک بھی نہیں لگاتا اور دوسروں کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کرتا ہے یہ گروہ ہے مذہبی علماء اور روحانی پیشواؤں کا جن کی تصریح قرآن کریم نے ان الفاظ میں کر دی کہ:

یایها الذین امنوا ان کثیرا من الاحبار والرهبان لیا کلون اموال الناس بالباطل و یصدون عن سبیل الله (۹/۳۴)

اے جماعت مومنین! (ان مذہبی عالموں اور روحانی پیشواؤں سے ہوشیار رہو) یہ (الا ماشاء اللہ) وہ لوگ ہیں جو دوسروں کا مال باطل طریق پر کھا جاتے ہیں۔ عوام بچارے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف دعوت دینے والے لوگ ہیں۔ حالانکہ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ خدا کی راہ کی طرف آنے نہ پائیں کیونکہ اس سے ان کی پیشوائیت ختم ہو جاتی ہے۔

اس کی وضاحت آگے چل کر یوں کر دی کہ

ان کی حالت یہ ہے کہ اپنے خود ساختہ مسلک کو شریعت خداوندی کا نام دے کر، لوگوں کو خدا کے سچے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ اس کے صاف اور سیدھے راستے میں خواہ مخواہ پیچ وخم پیدا کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے قانون مکافات اور حیات آخرت پر ان کا ایمان ہی نہیں ہوتا۔ انہوں نے مذہب کو محض بطور پیشہ اختیار کر رکھا ہوتا ہے۔ یہ وہ ظالم ہیں جن پر خدا کی لعنت برستی ہے۔(۱۱/۱۷-۱۹)

اس طرح یہ لوگ دین میں اختلافات پیدا کر کے، امت کو فرقوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ یہ وہ ظلم ہے جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ سورہ زخرف میں (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ضمن میں) ہے۔

فاختلف الاحزاب من بینهم فویل

للذین ظلموا من عذاب یوم الیم۔
(۴۳/۶۵)

ان میں مختلف گروہوں نے باہمی اختلاف پیدا کرلیا۔ سو جو لوگ اس طرح ظالم بن جائیں ان کے لئے الم انگیز تباہی کا عذاب ہوتا ہے۔

عام جرائم

یہ ظلم کی موٹی موٹی شقیں ہیں ان کے علاوہ قرآن کریم نے عام قوانین کی خلاف ورزی کو بھی (جسے جرائم سے تعبیر کیا جاتا ہے) ظلم کہہ کر پکارا ہے۔ مثلاً ان لوگوں کو جو میدان جنگ میں دغا دیں، ظالمین کہا ہے۔ (۳/۱۲۷) چوری کے جرم کو بھی ظلم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۳۹۔۳۸/۵) حتیٰ کہ ہر قسم کی لغزش کو بھی (۴/۶۴)۔ ان لغزشوں میں، معاشرتی زندگی کی وہ برائیاں بھی شامل ہیں، جو غلط معاشرہ میں اس قدر عام ہو جاتی ہیں کہ انہیں پھر برائیاں سمجھا ہی نہیں جاتا۔ مثلاً سورۂ حجرات میں ہے۔

اے جماعت مومنین! یاد رکھو۔ ایسا کبھی نہ ہو کہ تم میں سے ایک فریق، دوسرے فریق کا مذاق اڑانے لگ جائے اور اسے ذلیل اور حقیر کرنے کی کوشش کرے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ تم سے بہتر ہی ہوں۔۔۔ نہ تمہارے مرد یہ کچھ کریں نہ عورتیں۔ نہ ہی تم ایک دوسرے کے خلاف عیب لگاؤ (بہتان تراشی کرو) نہ طعن و تشنیع کرو۔ نہ ایک دوسرے کے الٹے پلٹے نام رکھو۔ جب تم ایمان لا کر بلند اخلاق کے حامل بننے کا تہیہ کر چکے ہو تو پھر آپس میں ایک دوسرے کے برے نام رکھنے کا کیا مطلب؟ یہ بری بات ہے۔ اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا ہے تو اسے اپنے کئے پر نادم ہو کر فوراً اس روش کو چھوڑ دینا چاہئے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کا شمار ظالمین میں ہو جائے گا۔ (۴۹/۱۱)

اس سے اگلی آیت میں یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے کے متعلق ہمیشہ حسن ظن سے کام لو اور بدگمانی سے بچو۔ نہ ہی کسی کی راز کی باتوں کی ٹوہ میں لگے رہو، نہ ہی ایک دوسرے کی غیبت کرو۔ یہ سب برائیاں ایسی ہیں۔ جو ظلم کی شق میں آجاتی ہیں۔ حتیٰ کہ جو لوگ قوانین خداوندی کا مذاق اڑائیں اور انہیں (Seriously) نہ لیں، انہیں بھی ظالم قرار دیا گیا ہے اور ان سے کنارہ کش رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ (۶/۶۸)

عدالتی نظام میں، مجرم کو اس کے جرم سے زیادہ سزا دینا بھی ظلم ہے۔ (۶/۶۱)

ظلم اور ہم

یہ ہیں ظلم کی نوعیتیں جو قرآن کریم کے مختلف مقامات میں بیان ہوئی ہیں۔ آپ انہیں سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ ان میں سے کوئی شق بھی ایسی ہے جو ہمارے معاشرہ میں (نہ صرف یہ کہ پائی نہ جاتی ہو بلکہ) عام نہ ہو چکی ہو! اس حقیقت کو سامنے رکھئے اور پھر قرآن کریم کے ان حتمی اور یقینی اعلانات کو سامنے لائیے، جنہیں اس نے اپنے غیر متبدل قوانین کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ یعنی یہ کہ

ظالم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا (۶/۲۱)

ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ (۲۸/۳۷)

ظالم قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ (۶/۴۷)

وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتی ہے۔ (۷/۴۴)

اس کی جڑ کٹ جاتی ہے اور انسانیت اس پر خدا کا شکر ادا کرتی ہے (۶/۴۵)

قرآن کریم نے یہ اصول اور قانون بیان کیا اور اس کی صداقت کی شہادت میں، وہ اقوام سابقہ کی سرگزشتوں کو سامنے لایا۔ اس نے، قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم مدین، قوم لوط، قوم فرعون، غرضیکہ تمام اقوام سابقہ کی تاریخ پیش کی ہے۔ اور واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ جب ان کے معاشرہ میں ظلم عام ہو گیا تو وہ تباہ ہو گئیں۔ وہ ان کے انفرادی تذکرہ کے بعد، بہ ہیئت مجموعی کہتا ہے کہ۔

یہ اقوام گزشتہ میں سے چند ایک کی سرگزشت ہے، جسے ہم، تم سے بیان کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض آبادیاں تو ابھی تک موجود ہیں اور باقی اجڑ چکی ہیں۔

تم نے ان کے حالات سے دیکھ لیا ہوگا کہ ہم نے ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کی انہوں نے خود ہی اپنے اوپر زیادتی کی تھی۔ سو جب ان کے اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت آ گیا تو وہ جن غیر خداوندی قوتوں کے احکام کی اطاعت کیا کرتے تھے اور انہیں اپنا خدا سمجھے بیٹھے تھے، وہ ان کے کسی کام بھی نہ آ سکیں۔ ان کی اطاعت اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکی کہ وہ الٹا ان کی تباہی کا موجب بن جائے۔

لہٰذا، تاریخ کے ان نوشتوں میں سے تم اس محکم اصول کو یاد رکھو، کہ جب بھی کسی قوم میں ظلم عام ہو جائے تو وہ خدا کے قانون مکافات عمل کی گرفت میں آ جاتی ہے۔ اور یہ گرفت بڑی سخت اور الم انگیز ہوتی ہے۔

اقوام گزشتہ کی ان داستانوں اور قانون مکافات کے اس غیر متبدل اصول میں ہر اس قوم کے لئے واضح دلائل ہیں جو مستقبل کی تباہیوں کے احساس سے خائف رہتی ہے اور اس سے بچنا چاہتی ہے۔ (۱۰۳۔۱۰۰/۱۱)

اس میں دوسروں کے لئے سامان عبرت اس لئے ہے کہ یہ محض اقوام سابقہ کے کوائف اور اخبار (Chronicles) نہیں جنہیں اساطیر الاولین (پرانے زمانے کے لوگوں کی کہانیاں) سمجھ کر پڑھ لیا جائے یہ، خدا کے اس قانون کی زندہ شہادات ہیں کہ جس قوم نے بھی ظلم کی روش اختیار کی اس کا انجام یہ ہوا۔ اس لئے جو قوم بھی اس قسم کی روش اختیار کرے گی۔ اس کا انجام اسی قسم کا ہوگا۔

فان للذین ظلموا ذنوبا مثل ذنوب اصحبھم (۵۱/۵۹)

ہر زمانے کے ظالمین کا انجام وہی ہوگا جو ان سے پہلے زمانے کے ظالمین کا ہوا تھا۔

فجعلنھم احادیث (۳۴/۱۹) وہ قومیں ختم ہو جاتی ہیں اور ان کی صرف داستانیں باقی رہ جاتی ہیں۔

ومزقنھم کل ممزق۔ (۳۴/۱۹) ان کی اجتماعی حیثیت فنا ہو جاتی ہے اور ان کے افراد ادھر ادھر بکھرے ہوئے باقی رہ جاتے ہیں۔ جو اپنی مٹی ہوئی عظمت کی عبرت ناک یادگار رہتے ہیں اور اپنے ماضی کی لاشوں کو اپنے کندھوں پر اٹھائے در بدر مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔ اقوام سابقہ کی ان داستانوں کے بیان کرنے سے قرآن کا مقصد یہی ہے۔ وہ ہر داستان کے بعد ہم سے کہتا ہے کہ۔

فانظر کیف کان عاقبۃ الظالمین (۱۰/۳۹)

دیکھو! ظالمین کا انجام کیسا ہوا؟

وہ کہتا ہے کہ تم یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب نہ دے لینا کہ وہ قومیں کمزور تھیں۔ انہوں نے اپنے وسائل پیداوار کو ترقی دے کر' ان سے کما حقہ' فائدہ نہیں اٹھایا تھا' اس لئے وہ تباہ ہو گئیں۔ یہ خیال غلط ہے۔

وہ قومیں شان و شوکت میں تمہاری قوم مخاطب سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں انہوں نے زمین کے سینے کو چیر کر اس میں چھپے ہوئے خزانوں کو باہر نکالا۔ ملکوں کو آباد کیا۔۔ ان کی آبادیاں' ان کی آبادیوں سے کہیں زیادہ تھیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ تباہ ہو گئیں۔ اس لئے نہیں کہ خدا نے انہیں یونہی ظلم و تعدی سے تباہ کر دیا۔ خدا کبھی ایسا نہیں کرتا۔ وہ تباہ اس لئے ہوئیں کہ انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کر رکھا تھا۔ (۹/۳۰)

دوسری جگہ ہے ہم نے کتنی ہی ایسی قومیں تباہ کر دیں جن کی معاشی حالت نہایت اعلیٰ تھی۔ انہیں سامان زینت کی فراوانیاں حاصل تھیں۔ یہ ہیں ان کی ویران شدہ بستیاں جن میں ان کے بعد کوئی بھی آباد نہ ہوا۔ اور ان کے وارث صرف ہم قرار پائے۔۔۔۔۔۔ یہ اس لئے کہ وہ قومیں ظالم تھیں اور ہم ظالم قوموں ہی کو تباہ کیا کرتے ہیں۔ (۲۸/۵۸۔۵۹)

اپنے آپ پر ظلم

ہم نے اوپر (آیت ۹/۳۰ میں) دیکھا ہے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ ان تباہ ہونے والی قوموں پر خدا نے ظلم و زیادتی نہیں کی تھی۔ ''انہوں نے خود اپنے آپ پر زیادتی کی تھی۔'' (ولکن انفسھم یظلمون) قرآن کریم نے یہ اصطلاح' ظلم کے سلسلہ میں اکثر و بیشتر استعمال کی ہے اور یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے قرآن سادہ سے انداز میں پیش کرتا ہے۔ ظالم سمجھتا یہ ہے کہ وہ دوسرے کو نقصان پہنچا رہا ہے لیکن اگر وہ ذرا بہ نظر تعمق دیکھے تو اسے نظر آ جائے کہ وہ کسی دوسرے کو نقصان نہیں پہنچا رہا بلکہ خود اپنی ذات کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ وہ بزعم خویش دوسروں کو تباہ کرتا ہے لیکن درحقیقت اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہوتا ہے۔ بالا دست جماعت یا قوم' کمزور جماعتوں یا قوموں کو کچلتی ہے اور اس میں بڑی لذت محسوس کرتی ہے لیکن اس ظلم و تعدی سے وہ درحقیقت خود اپنی جڑیں کھوکھلی کر رہی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہر تباہ ہونے والی قوم کی داستانِ حیرت و موعظت بیان کرنے کے بعد' واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ

وما ظلمنھم ولکن ظلموا انفسھم (۱۱/۱۰۰)

ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا' انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم و زیادتی کی تھی' جس کی وجہ سے وہ تباہ ہو گئے۔

تباہی کہاں سے آتی ہے؟

یہ قومیں عقل و شعور کی مالک ہوتی ہیں۔ اس لئے اپنی طرف سے پورا پورا انتظام کر لیتی ہیں کہ ان پر کہیں سے تباہی نہ آنے پائے وہ سیاسی تدبر کی فسوں سازیوں سے' وہ تمام راستے بند کر لیتی ہیں جن سے وہ سمجھتی ہیں کہ ان کی تباہی کے اسباب اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ وہ ہر ممکن خطرہ کی روک تھام کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کر لیتی ہیں۔ وہ ہر سر اٹھانے والے کا سر' قبل اس کے کہ وہ سر اٹھے' کچل کر رکھ دیتی ہیں۔ وہ اپنی طرف سے اپنی حفاظت کا سارا اہتمام کر لیتی ہیں۔ وہ اپنی سیاست کے محکم قلعوں میں (بزعم خویش) مصئون و مامون ہو کر بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن نہیں سمجھتیں کہ ان قلعوں کی بنیاد میں خرابی کی ایک صورت مضمر ہے جو اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کئے جا رہی ہے۔ چنانچہ' ان کی ان تمام تدابیر کے علی الرغم'

ان پر تباہی کا عذاب ان راستوں سے آ جاتا ہے جو ان کی عقل وشعور تک میں نہیں ہوتے۔قرآن کے الفاظ میں:

جو کچھ یہ کر رہے ہیں' کوئی نئی بات نہیں۔ ان سے پہلی قوموں نے بھی اسی قسم کی ڈپلومیٹک تدابیر اختیار کر رکھی تھیں کہ کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے نہ پائے۔لیکن خدا کے قانون مکافات نے ان کے نظام تمدن کی بنیادوں تک کو ہلا دیا' اور اس کی چھتیں ان کے اوپر آ کر گریں۔ انہوں نے اپنی طرف سے تباہی کے ہر راستے بند کر رکھے تھے۔لیکن تباہی ان پر ان راستوں سے آ پہنچی جو ان کی عقل وشعور تک میں نہ تھے۔(۱۶/۲۶)

تباہی کی شکلیں

یہ تباہی کن شکلوں میں آتی ہے'اس کے متعلق کہا کہ

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے اوپر کے طبقہ میں خرابیاں عام ہو جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ کبھی نیچے کے طبقہ میں لاقانونیت پھیل جاتی ہے تو وہ تباہی مچا دیتے ہیں۔کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ دونوں طبقے مخلوط پارٹیاں بنا لیتے ہیں اور ایک دوسرے سے لڑ کر تباہ ہو جاتے ہیں۔(۶/۶۵)

لیکن ظالم قوم کی تباہی کی موثر ترین صورت وہ ہے جس میں مظلوم طبقہ قوانین خداوندی کے مطابق' اپنے اندر نظم وضبط پیدا کر کے'ایک ایسا نظام قائم کر لیتا ہے جس میں ہر ظالم کو نظر آ جاتا ہے کہ اس کا صحیح مقام کون سا ہے قرآن کریم نے (سورۂ شعراء میں) ''زندگی سے شاعری کرنے والی'' جماعتوں کے مقابلہ میں' قوم مومنین کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

ان کے برعکس' وحی پر ایمان لانے والے ہیں جو ایک متعین نصب العین پر یقین رکھتے ہیں اور ایسے پروگرام پر عمل پیرا رہتے ہیں جو ان کی اپنی ذات کی صلاحیتوں کی بھی نشوونما کرے' اور دنیا کے بگڑے ہوئے کام بھی سنوارے۔ وہ زندگی کے ہر گوشے میں قوانین خداوندی کو سامنے رکھتے ہیں۔ اسے کبھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ جب ان پر کوئی ظلم وزیادتی کرتا ہے تو وہ شاعروں کی طرح اس کی ہجو لکھ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا نہیں کر لیتے بلکہ اس سے اس ظلم وزیادتی کا بدلہ لیتے ہیں اور ایک ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں ظلم وزیادتی کرنے والے بدلگام نہ پھرتے رہیں بلکہ انہیں نظر آ جائے کہ ان کا صحیح مقام کونسا ہے جس کی طرف انہیں لوٹا کر لایا جائے گا۔اسے انقلاب کہا جاتا ہے(۲۶/۲۲۷)

قوموں کی تباہی سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ ان کا کوئی فرد باقی نہیں رہتا۔اس سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ان کی شان وشوکت' قوت وثروت' عزت وعظمت' حکومت وسطوت چھن جاتی ہے اور وہ دنیا میں ذلت وخواری کی زندگی بسر کرتی ہیں۔

فاذلھم اللہ الخزی فی الحیوۃ الدنیا.....
(۳۹/۲۶)

ان کے ظلم کا نتیجہ یہ تھا کہ انہیں اسی دنیا میں ذلت وخواری کی زندگی بسر کرنی پڑی (اور مستقبل کا عذاب اس سے کہیں زیادہ ہوگا)۔

دوسرے مقام پر کہا ہے کہ فاذاقھا اللہ لباس الجوع والخوف (۱۶/۱۱۲) ان پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری ہو گیا۔یعنی وہ اپنی روٹی تک کے لئے دوسروی قوموں

کے محتاج ہو گئے اور انہیں اپنی ملی ہستی کی حفاظت کے لئے ہر وقت دھڑکا لگا رہا۔ یہ ہیں قوموں کی تباہی کی علامات۔ سورہ طٰہٰ میں قرآن کریم نے اسے ایک ایسے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کے اجمال میں ہزار تفاصیل پوشیدہ ہیں۔ کہا۔ وقد خاب من حمل ظلما۔ (۲۰/۱۱۱) الخیاب اس چقماق کو کہتے ہیں جس سے آگ کی چنگاری نہ نکلے۔ یعنی ظلم کرنے والی قوموں کی کیفیت اس چقماق کی سی ہو جاتی ہے جس کی شکل وصورت تو ویسے کی ویسی ہی رہے لیکن اس میں زندگی بخش حرارت باقی نہ رہے وہ شعلہ افسردہ کی طرح ہو جائے۔ یہ ہے ہلاک شدہ قوموں کا عبرت انگیز مرقع۔

مہلت کا وقفہ

آپ نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہو گا کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ ظالم پنپ نہیں سکتا لیکن ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ ظالم دن رات پنپتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا ہر پروگرام کامیاب ہوتا ہے۔ وہ کھلے بندوں دندناتے پھرتے ہیں اور کوئی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ افراد کا بھی یہی حال ہے اور اقوام کی بھی یہی کیفیت' جو قوم قوت فراہم کر لے' وہ دوسری قوموں کے خلاف جو جی میں آئے کرے' اسے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا' ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ مظلوم اور کمزور پستے چلے جاتے ہیں اور ظالم اور قاہر بپھرے پھرتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ تمہاری نگاہ کی محدودیت ہے جو صرف چند قدموں تک دیکھ سکتی ہے' اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ اگر تمہاری حد نگاہ وسیع ہوتی تو تم دیکھ لیتے کہ ظالم' انجام کار' تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ خدا کے قانون مکافات کی رو سے' عمل اور اس کے نتیجہ کے محسوس شکل میں سامنے آنے میں ایک مدت ہوتی ہے' جسے مہلت کا وقفہ کہا جاتا ہے۔ ہر عمل کا نتیجہ تو اس کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن وہ محسوس شکل میں ایک مدت کے بعد جا کر سامنے آتا ہے۔ تمہاری نگاہ اس ''مہلت کے وقفہ'' میں الجھ کر رہ جاتی ہے اور تم خیال کر لیتے ہو کہ ظلم نتیجہ خیز ہو ہی نہیں رہا۔ بس یہ ہے تمہاری بھول۔ سورۂ ابراہیم میں ہے۔

> تم اس کا وہم وگمان تک بھی نہ کرو کہ یہ ظالم اور سرکش لوگ جو کچھ کر رہے ہیں ہم اس سے بے خبر ہیں۔ ہمارا قانون مکافات سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ لیکن یہ وقفہ مہلت کا ہے۔ جب ظہور نتائج کا وقت آ جائے گا' اس وقت تباہیوں کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ کر ان کی حالت یہ ہو جائے گی کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ افراتفری کا یہ عالم ہو گا کہ یہ ادھر ادھر دیکھے بغیر' منہ اٹھائے' بدحواس بھاگے چلے جائیں گے۔ سب ان کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ حتیٰ کہ ان کی نگاہ بھی کاشانہ چشم میں لوٹ کر نہیں آئے گی۔ ان کے دل امیدوں سے خالی ہو جائیں گے۔ یاس انگیز تاریکیاں ان پر بری طرح چھا جائیں گی۔ (۱۴/۴۲۔۴۳)

دوسرے مقام پر اس قانون تدریج وامہال کی حکمت بھی بیان کر دی ہے۔ جہاں کہا ہے کہ

> اگر کائنات کے ارتقاء میں تدریجی قانون کارفرما نہ ہوتا' اور خدا کا قانون مکافات لوگوں کے ظلم وزیادتی پر ان کی فوری گرفت کر لیا کرتا' تو صفحہ ارض پر کوئی چلنے والا (انسان) نظر نہ آتا۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرتا' بلکہ انہیں مقررہ تاریخی منازل تک پہنچانے کے لئے ان کے انجام کو موخر کرتا جاتا ہے اور جب وہ اپنے مستقر تک پہنچ جاتے ہیں تو اس کے

بعد نہ ایک ثانیہ کی دیر ہوتی ہے' نہ سویر۔ ان کے اعمال کا آخری فیصلہ کن نتیجہ سامنے آجاتا ہے۔(۱۶/۶۱)

اسی کو قرآن نے ''پلڑا جھکنے'' (ثقلت موازینه) سے تعبیر کیا ہے۔ قوموں کو سرفرازی اس وقت نصیب ہوتی ہے جب ان کے تعمیری کاموں کا پلڑا جھکا ہوتا ہے۔ اس کے بعد' ان کی تخریبی کارفرمائیاں شروع ہو جاتی ہیں تو تعمیری پلڑا آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس دوران میں اگر وہ اپنی اصلاح کر لیں اور تعمیری کاموں کے وزن میں اضافہ کر لیں تو وہ تباہی سے بچ جاتی ہیں (مہلت کے وقفہ سے دراصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہلاکت سے پہلے' باز آفرینی کا موقعہ بہم پہنچایا جائے) لیکن اگر وہ اپنی روش سے باز نہیں آتیں' تو تخریبی پلڑا بھاری ہوتا چلا جاتا ہے اور جب وہ تعمیری پلڑے کے مقابلہ میں زیادہ جھک جاتا ہے' تو قوم پر تباہی آجاتی ہے اس وقت بازیابی کا موقعہ باقی نہیں رہتا۔ تباہی کے اس طرح محسوس شکل میں سامنے آنے سے' انہیں خدا کے قانون مکافات کی صداقت کا یقین آجاتا ہے لیکن اس وقت یہ احساس و یقین انہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ دیکھئے سورۂ مومن میں اس حقیقت کو کس قدر رواشگاف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

اگر یہ لوگ اس امر کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں کہ ظلم و تعدی سے قومیں کس طرح تباہ ہوا کرتی ہیں' تو ان سے کہو کہ ذرا دنیا میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جو قومیں تم سے پہلے ہو گزری ہیں' ان کا انجام کیا ہوا۔ وہ تعداد میں بھی ان سے زیادہ تھے اور قوت میں بھی ان سے بڑھ چڑھ کر' انہوں نے زمین سے پیدا ہونے والے سامان زیست پر بھی ان سے کہیں زیادہ تصرف حاصل کر رکھا تھا۔ لیکن ان کا مال و دولت اور ان کی ہنرمندی و کاری گری۔ انہیں ان کے غلط اعمال کے تباہ کن نتائج سے بالکل نہ بچا سکے۔ وہ سب دھرے کا دھرا رہ گیا۔

جب ان کے رسول ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے تو انہوں نے ان کی تکذیب کی' اور اپنے علم و ہنر پر نازاں رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس تباہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے' اس نے انہیں آدبوچا۔

جب انہوں نے اس تباہی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو چلا اٹھے اور کہنے لگے کہ ہم خدائے واحد پر ایمان لاتے ہیں اور جن قوتوں کو ہم اس کے شریک سمجھتے تھے' ان سے انکار کرتے ہیں۔

لیکن اس ایمان نے انہیں کچھ فائدہ نہ دیا۔ جسے وہ عذاب کو دیکھ کر لائے تھے۔ ایمان وہی نفع بخش ثابت ہو سکتا ہے جو ظہور نتائج سے پہلے لایا جائے کیونکہ اس صورت میں ہنوز وقت ہوتا ہے کہ انسان' تعمیری کاموں سے' سابقہ تخریبی اعمال کے مضر اثرات کا ازالہ کر سکے۔ (۴۰/۸۲-۸۵)

اور اس کے بعد ہے:

سنت اللہ التی قد خلت فی عباده (۴۰/۸۵)

یہ خدا کا وہ قانون ہے جو انسانوں پر شروع سے نافذ ہوتا چلا آرہا ہے۔

اس وقت نہ تو ان کا ایمان کچھ کام دے سکے گا اور نہ ہی ان کا چیخنا چلانا کچھ کفایت کر سکے گا۔ یہ مدد کے لئے چیخیں

چلائیں گے اور کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں ایک بار یہاں سے نکال دے' پھر دیکھ کہ ہم کس طرح اپنی سابقہ روش کے خلاف' تیرے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اچھے کام کرتے ہیں۔ ان سے کہا جائے گا کہ کیا تمہیں اتنی عمر نہیں دی گئی تھی کہ تم میں سے جو ہمارے قانون کے مطابق نصیحت حاصل کرنا چاہتا وہ اس کے لئے کافی ہو جاتی؟ اور پھر تمہارے پاس وہ پیغامبر بھی آ گیا تھا جو تم سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ تمہاری روش تمہیں تباہی کے جہنم کی طرف لے جائے گی۔ لیکن تم نے اس کی ایک نہ مانی۔ سو اب تم اپنے اعمال کے نتائج بھگتو۔ اب کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ ظلم کرنے والوں کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا۔ (۳۵/۳۷)

کارگہِ کائنات کیوں سرگرمِ عمل ہے؟

ہمارے سامنے لوگوں کے غلط اعمال کی سزا کے لئے دنیا کا عدالتی نظام ہی ہوتا ہے جو ناقص بھی ہو سکتا ہے اور خائن (بددیانت) بھی۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ ظلم کرنے والے دندناتے پھرتے اور دن بدن پھولتے پھلتے چلے جاتے ہیں' اور انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا ہی نہیں' تو یہ دنیاوی نظام عدل کا نقص نہیں ہوتا۔ اس کا ایک اپنا نظام ہے جو نہ ناقص ہو سکتا ہے نہ خائن۔ اس کی نتیجہ خیزی اٹل ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تمام سلسلہ کائنات اسی نظام عدل کو قائم رکھنے کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔

وخلق الله السموات والارض بالحق۔ ولتجزی کل نفس بما کسبت وهم لا یظلمون۔ (۴۵/۲۲)

تا کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملتا رہے اور کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہ ہو (نیز ۱۹/۴۶'۴/۱۲۴'۴/۶۰'۱۹)

''کسی پر کسی قسم کا ظلم و زیادتی نہ ہو''۔۔ یہ ہے مقصدِ تخلیق کائنات۔۔ اسی کا نام خدا کا قانون مکافاتِ عمل ہے' جسے عوام کی زبان میں ''خدا کی چکی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ چکی پیستی تو بے شک بہت باریک ہے لیکن اس کی رفتار (ہمارے حساب و شمار کے مطابق) بہت سست ہوتی ہے اور مظلوم کی یہ انتہائی آرزو ہوتی ہے کہ وہ ظالم کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

یہ تجھ سے کہتے ہیں کہ وہ تباہی جلد آنی چاہئے۔۔ وہ تباہی ضرور آئے گی۔ خدا کا قانون اٹل ہے لیکن اس کی رفتار بڑی سست ہے۔ خدا کا ایک دن' تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے (۲۲/۲۷)

اب اس کا کیا کیا جائے؟ مظلوم کے دل کی پکار رہ رہ کر کہتی ہے کہ ؎

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

یہ ہے ''بیتابیِ تمنا اور صبر طلبیِ عشق کی وہ کشمکش' جس کے حل کے لئے قرآن چاہتا ہے کہ دنیا میں خود انسانوں کے ہاتھوں ایک ایسا نظام قائم ہو جو لوگوں کے اعمال کی نتیجہ براری میں تو' نظام کائنات کے مماثل ہو' لیکن اس کی رفتار اتنی سست نہ ہو۔ اس کا نام دین کا نظام' یا اسلامی مملکت ہے جس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ۔۔۔ لتجزی کل نفس بما کسبت۔ وهم لا

یظلمون۔ ہر متنفس کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے' اور کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہ ہو' اس نظام کو سب سے پہلے حضور نبی اکرمؐ نے متشکل کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ خدا کا وہی دن' جو نظام کائنات میں ایک ایک ہزار سال کا ہوتا ہے' اس نظام میں کس طرح چوبیس گھنٹے کا بن جاتا ہے یہ وہ نظام ہے جو دنیا کے کسی جابر اور ظالم سے کسی قسم کی مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اس نظام کے داعیؐ کو آگاہ کر دیا گیا کہ یاد رکھو:

یہ لوگ چاہیں گے کہ اگر تم تھوڑا سا ان کی طرف جھک جاؤ تو یہ تمہاری طرف جھک جائیں۔ دیکھنا' ایسا نہ کرنا۔ (۶۸/۹)

ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار۔ (۱۱۳/۱۱)۔ اگر تم ذرا بھی ان کی طرف جھک گئے اور اس طرح ان سے مفاہمت کر لی' تو یاد رکھو تم بھی اسی جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ جس میں یہ لوگ ماخوذ ہیں۔۔ تمہارا نظام' عدل پر مبنی ہے اور عدل اگر ذرا سا بھی ظلم کی طرف مائل ہو جائے تو وہ عدل نہیں رہتا' ظلم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے مفاہمت کی کوشش کی' تو اس نظام کے داعی برحقؐ نے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ میں قوانین خداوندی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ میں تو خود انہی کا اتباع کرتا ہوں۔

انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم (۱۰/۱۶)

اگر میں بھی قانون خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو مجھے اس کے نتیجے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں بھی اسی عذاب کی لپیٹ میں آ جاؤں گا۔

یہ تھا وہ نظام' جس کے متعلق اعلان کر دیا کہ یاد رکھو:

اس میں کوئی شخص کسی کے جرم کا ذرا سا بھی بوجھ نہیں بٹا سکے گا۔ ہر ایک کو اپنے کئے کی سزا خود بھگتنی پڑے گی۔ نہ ہی کسی کی شفاعت کسی کے کام آئے گی' نہ ہی کسی سے اس کے جرم کے معاوضہ میں کچھ رشوت لے کر اسے چھوڑ دیا جائے گا' نہ ہی کوئی شخص کسی مجرم کا حمائتی بن سکے گا۔ (۴۸/۲)

دنیا کے نظام عدل کی رو سے' اگر کسی مقدمہ کا فیصلہ مروجہ قانون کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہو جائے' تو عدل کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے لیکن قرآن کریم اس سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ قانون کے مطابق فیصلہ عدل کہلائے گا۔ لیکن اگر خود وہ قانون ہی ظلم اور ناانصافی پر مبنی ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کس طرح مبنی بر عدل قرار پا سکتا ہے؟ لہٰذا' وہ اس نظام کے متعلق جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے کہتا ہے کہ اس میں قانون سازی کا اختیار انسانوں کو حاصل ہی نہیں ہوتا۔ اصولی طور پر قوانین' خدا کے نازل کردہ ہوتے ہیں اور وہ نظام ان کے مطابق فیصلے کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

یھدون بالحق و بہ یعدلون۔ (۱۵۹/۷)

یہ لوگ دوسروں کو حق کی راہ بتاتے ہیں اور اسی کے مطابق عدل کرتے ہیں۔

یہی وہ حقیقت ہے' جسے شروع میں بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے وہ لوگ ظالم ہیں جو "ماانزل اللہ" کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ (۴۵/۵)

ظلم کی مختلف نوعیتیں، جنہیں قرآن کریم نے اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے، ہمارے سامنے آ گئیں۔ آپ انہیں دیکھئے اور سوچئے کہ ان میں سے کوئی شق بھی ایسی ہے آج باقی دنیا کو تو چھوڑیئے خود ہمارے معاشرے میں نہ پائی جاتی ہو؟ آپ دیکھیں گے کہ ظلم کی ان شقوں کا ہمارے ہاں پایا جانا تو ایک طرف، یہ ہمارے معاشرہ کا معمول بن چکی ہیں اور اس قدر عام ہو چکی ہیں کہ ان سے اب ہمارے دل میں کھٹک تک پیدا نہیں ہوتی۔۔ اگر کھٹک پیدا ہوتی ہے تو صرف اس وقت جب کوئی دوسرا ہم پر زیادتی کرے۔

اس کے بعد، آپ پھر وہیں چلے چلئے جہاں سے بات شروع کی گئی تھی۔ یعنی ایک ذہنیت یہ ہے کہ یہ کہنا کہ ظالم پنپ نہیں سکتا۔۔ ظلم کا انجام تباہی ہوتا ہے، کمزوروں اور ناتوانوں کی خود فریبی ہے جو فرد یا قوم، قوت حاصل کر کے اپنی مدافعت کا سامان مہیا کر لیتی ہے، اسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دنیا کا یہی چلن رہا ہے، یہی چلن رہے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسے معاشرہ میں سارا زور اپنی قوت اور مدافعت کا سامان مہیا کرنے پر دیا جائے گا۔ ظلم و جور سے رکنے کا خیال کبھی پیدا نہیں ہوگا۔

دوسری ذہنیت یہ ہے کہ خدا کا یہ اٹل قانون ہے کہ ظالم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور جس معاشرہ میں ظلم کا چلن عام ہو، وہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ خواہ اس نے اپنی حفاظت اور مدافعت کے کتنے ہی انتظامات کیوں نہ کر رکھے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسے معاشرہ میں، ساری کوشش ظلم سے رکنے کی، کی جائے گی۔

اول الذکر ذہنیت کا نام خدا سے انکار (کفر) ہے اور دوسری کو خدا پر ایمان (اسلام) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ ہمارا شمار کس زمرے میں ہو سکتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اسے بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے، کہ قانون خداوندی کے اٹل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اگر آپ اس پر ایمان رکھتے ہیں تو وہ اپنا نتیجہ پیدا کرے گا اور اگر آپ اسے صحیح تسلیم نہیں کرتے تو وہ معطل ہو جائے گا۔ قطعاً نہیں۔ وہ قانون بہر حال اور بہر حیثیت اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہے گا۔ خواہ آپ اسے صحیح مانیں یا نہ مانیں۔ سنکھیا بہر حال مہلک ہے، خواہ آپ اس کی ہلاکت آفرینی کو صحیح تسلیم کریں یا جھوٹ سمجھیں۔۔ اور سنکھیا اس شخص کو بھی اسی طرح ہلاک کر دے گا جو زبان سے اس کی ہلاکت آفرینی کا اقرار کرے لیکن پھر بھی اسے پھانک لے، جس طرح اس شخص کو ہلاک کر دے گا جو اس کی ہلاکت آفرینی کا کھلے بندوں انکار کرتا ہوا اسے چاٹ لے لہذا اگر خدا کا یہ قانون اٹل ہے۔۔ اور اس کے اٹل ہونے میں شبہ ہی کیا ہے۔۔ (کہ جس قوم میں ظلم عام ہو جائے وہ تباہ ہو جاتی ہے۔) اور ہماری روش یہی رہی، تو ''پاکستان زندہ باد کے ہزار نعروں، اور ''ملت اسلامیہ پائندہ باد'' کی لاکھ تمناؤں کے باوجود، ہم تباہی سے بچ نہیں سکتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بیرونی خطرات سے ملک کی حفاظت کا انتظام نہایت ضروری ہے، اور ایسا انتظام ضرور کرنا چاہئے اور ملک کے ہر باشندے کو اس میں پورا پورا حصہ لینا چاہئے (کہ اپنی سرحدوں کو مضبوط و مستحکم رکھنے کا حکم بھی خداوندی ہے) اس میں بھی کلام نہیں کہ ملک کی خوشحالی اور فارغ البالی کے لئے مادی ترقی بھی نہایت ضروری ہے (کہ بھوک کو خداوند کریم نے خدا کا عذاب قرار دیا ہے) لیکن، ان تمام انتظامات و اہتمامات کے باوجود، ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اگر ہم نے اپنے معاشرہ میں ظلم کی بڑھتی ہوئی رو کو نہ روکا، تو یہ انتظامات و

اہتمامات ہمیں تباہی سے کبھی نہیں بچا سکیں گے' نہ ہی ہماری مروجہ نمازیں اور ہمارے روزے' ہمارا حج اور ہماری زکوٰۃ' ہماری نذریں اور ہماری نیازیں' ہمارے وعظ اور ہمارے خطبے' ہمیں اس تباہی سے محفوظ رکھ سکیں گے' کہ خدا نے یہ کہیں نہیں کہا کہ ظالم قوم کی رسمی مذہب پرستی اسے ظلم کی آوردہ تباہی سے بچالے گی۔

جب ہم ظلم کا لفظ زبان پر لاتے ہیں تو ہماری نگاہیں ہمیشہ اعمال حکومت اور ارباب نظم ونسق کی طرف اٹھ جاتی ہیں اور ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ ظلم ان کی طرف سے ہوتا ہے ہم اس کے مجرم نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ظلم عام طور پر اپنی شدید اور محسوس شکل میں غلط نظام حکومت اور ارباب اقتدار کی غلط کوشیوں اور غلط کاریوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے ظلم کی جن نوعیّتوں کا ذکر کیا ہے' انہیں ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے اور دیکھئے کہ ان میں سے کتنی شقیں ایسی ہیں جن کے مرتکب ہم خود ہوتے ہیں۔ لہٰذا جس معاشرہ میں قرآنی تصور کے مطابق ظلم کا دور دورہ ہو۔ اس میں ظلم کسی خاص طبقہ تک محدود نہیں ہوتا۔ اس کے جراثیم سارے جسد معاشرہ میں حلول کئے ہوتے ہیں۔

لیکن اگر یہ تصور بھی کر لیا جائے کہ ظلم کسی خاص طبقے کی طرف سے ہوتا ہے' ہم اس کے مرتکب نہیں ہیں۔ تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ظلم کی وجہ سے جب معاشرہ پر تباہی آئے گی تو وہ چن چن کر ان افراد کو گھیر لے گی۔ جو ظلم کے مرتکب ہوئے تھے اور ہمیں چھوڑتی جائے گی۔ قطعاً نہیں۔ جب قوموں پر تباہی آتی ہے تو پھر۔۔ نہ کہ را منزلت باشد نہ مہہ را۔۔۔ اس سے ساری کی ساری قوم تباہ ہوا کرتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ

واتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصة (۸/۲۵)

اس تباہی سے اپنے آپ کو بچانے کی (قبل از وقت) تدبیر کر لو کہ جب وہ آتی ہے تو پھر انہی لوگوں تک محدود نہیں رہا کرتی جنہوں نے ظلم کیا تھا۔

جب کسی ناعاقبت اندیش کے کشتی میں چھید کر دینے سے کشتی میں پانی بھر جاتا ہے تو اس سے صرف وہی شخص نہیں ڈوبا کرتا جس نے کشتی میں چھید کیا تھا۔ کشتی کے تمام مسافر ڈوب جایا کرتے ہیں۔

وہ ہے خدا کا قانون' اور یہ ہے (باقی دنیا کے ساتھ) ہمارے معاشرہ کی موجودہ حالت۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ابھی اس مہلت کے وقفہ سے گزر رہے ہیں جو تباہی سے پہلے آتا ہے اگر ہم اب بھی سنبھل جائیں تو ہمارے بچاؤ کی صورت ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر ہم نے اس وقفہ سے فائدہ نہ اٹھایا اور اسی رفتار سے آگے بڑھتے گئے' تو پھر خدا کا اٹل قانون اپنا نتیجہ مرتب کر کے رہے گا اور ہمارا حشر بھی انہیں قوموں جیسا ہو جائے گا۔ جن کے متعلق کہا ہے کہ:

واورثنها قوما اخرين

وہ قوم تباہ ہو گئی اور ہم نے کسی دوسری قوم کو اس کا وارث بنا دیا۔

فما بكت عليهم السماء والارض

پھر ان کی تباہی پر نہ آسمان نے آنسو بہائے نہ زمین کی آنکھ نم آلود ہوئی۔

وما كانوا منظرين (۴۴/۲۸۔۲۹)

اور نہ ہی انہیں اس کی مہلت دی گئی' کہ اپنے بچاؤ کا سامان کر سکیں۔

لہٰذا۔۔۔

''حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں''

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مفسدین کا انجام

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

پرویز

﴿''ظالم پنپ نہیں سکتا'' آپ نے ملاحظہ فرمالیا ہوگا جس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ظلم کا انجام کیا ہوتا ہے۔ زیرنظر مقالہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں واضح کیا گیا ہے کہ خدا کے قانون مکافات کی رو سے فساد کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس وقت جبکہ ساری دنیا کی کیفیت وہ ہوچکی ہے جس کا نقشہ قرآن کریم نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس (۳۰/۴۱) ''لوگوں کے خودساختہ نظام واعمال کا نتیجہ یہ ہے کہ کرۂ ارض پر ہر جگہ فساد ہی فساد نظر آ رہا ہے'' ان تنذیرات قرآنی کا بار بار سامنے لانا نہایت ضروری ہے' بالخصوص اپنی قوم کے سامنے جو قرآن کریم پر ایمان رکھنے کی مدعی ہے۔ طلوع اسلام﴾

اصلاح اور فساد' قرآن کریم کی دو اہم اصطلاحات ہیں اور ایک دوسرے کی ضد۔ ہمارے ہاں' فساد کا لفظ' دنگہ فساد یا لڑائی جھگڑے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور ''صلح'' کا لفظ ''صلح صفائی'' کے لئے' اور اصلاح' ریفارم کے معنوں میں۔ لیکن (عربی زبان اور) قرآن کریم میں یہ اصطلاحات' ان سے کہیں زیادہ وسیع معانی میں استعمال ہوئی ہیں۔ صلح کے بنیادی معنی ہوتے ہیں ''جس چیز کو جس حال میں ہونا چاہئے' اس کا ٹھیک ٹھیک اسی حال میں ہونا''۔ چنانچہ معاشرہ کی ناہمواریاں دور ہو جانے اور افراد کی صلاحیتوں کے مناسب نشوونما پا لینے کے لئے بھی یہی الفاظ آتے ہیں۔ اعمال صالحہ' ان کاموں کو کہتے ہیں جن سے حسن کائنات میں نکھار پیدا ہو' جن سے معاشرہ کے بگڑے ہوئے کام سنور جائیں۔ اور انسانی ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے۔ فساد اس کی ضد ہے جس کے معنی ہیں' بگاڑ پیدا ہونا۔ توازن بگڑنا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کے پرکھنے کا معیار کیا ہے کہ ایک چیز کو جس حالت میں ہونا چاہئے وہ اس حالت میں ہے یا نہیں۔ طبیعی اشیاء (Physical Things) کے متعلق یہ معلوم (یا طے) کرنا آسان ہے کہ جس شئے کو جس حالت میں ہونا چاہئے وہ اس حالت میں ہے یا نہیں۔ معمل (یعنی لیبارٹری) کا ٹسٹ' اس کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ لیکن انسانوں کی اخلاقی اور تمدنی دنیا میں اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی مفسد' اس کا

اقرار واعتراف نہیں کرتا کہ وہ فساد پیدا کر رہا ہے۔ اس کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ وہ مصلح (اصلاح کرنے والا ہے) چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ

واذا قیل لہم لا تفسدوا فی الارض۔
قالوا انما نحن مصلحون۔ (۲/۱۱)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ملک میں فساد مت برپا کرو تو یہ کہتے ہیں کہ (ہم فساد کب برپا کرتے ہیں) ہم تو مصلح ہیں۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک شخص بدنیتی سے فساد کو اصلاح سے تعبیر نہ کرتا ہو بلکہ نہایت نیک نیتی سے فساد کو اصلاح سمجھ کر اس کے لئے کوشاں ہو۔ لیکن نتیجہ بہرحال دونوں صورتوں میں ایک ہی مرتب ہوگا۔۔۔ لہٰذا اس چیز کو لوگوں کے انفرادی فیصلے پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اس کے لئے کوئی خارجی معیار (Objective Standard) ہونا چاہئے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے، حسب معمول، ہماری توجہ خارجی کائنات کے نظم ونسق کی طرف مبذول کرائی ہے اور کہا ہے، کہ تم دیکھتے ہو کہ کارگہ کائنات کس طرح ٹھیک ٹھیک چل رہا ہے۔ اس میں ہر شے ویسی ہی ہوتی ہے جیسی اسے ہونا چاہئے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ آج بارش کے پانی کے اجزاء کچھ اور ہوں اور کل وہ کچھ اور ہو جائیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ جو کے بیج سے گندم پیدا ہو جائے اور گندم کے بیج سے جو۔۔ سورج کبھی کہیں سے طلوع ہونا شروع ہو جائے اور کبھی کہیں سے، چاندنی کا رنگ آج کچھ اور ہو اور کل کچھ اور، کبھی خزاں میں پھول کھلنے لگ جائیں اور بہار میں مرجھا جائیں۔۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ

(۱) کائنات میں۔۔ صرف ایک خدا کا قانون نافذ العمل ہے، کسی اور کا نہیں۔۔ اس لئے یکساں حالات میں ہر عمل کا نتیجہ بھی ایک جیسا مرتب ہوتا ہے۔ اسے سائنس کی اصطلاح میں (Law of Uniformity of Nature) کہتے ہیں۔۔ اور

(۲) ہر شے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے جو اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ وہ قانون کو اپنی مرضی کے تابع نہیں رکھتی۔

اول الذکر کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ۔

لو کان فیہما الہۃ الا اللہ لفسدتا
(۲۱/۲۲)

اگر ارض وسما (کائنات) میں خدا کے علاوہ کوئی اور صاحب اقتدار بھی ہوتا تو اس میں فساد برپا ہو جاتا۔

اور ثانی الذکر کے سلسلہ میں کہا کہ

ولو اتبع الحق اہواء ہم لفسدت السمٰوٰت والارض ومن فیہن۔
(۲۳/۷۱)

اگر حق (خدا کا قانون محکم) لوگوں کی مرضی کے تابع ہو جائے، تو ساری کائنات میں فساد برپا ہو جائے۔

یعنی فساد (بگاڑ) سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ (۱) قانون ایسا ہو جو کسی کی خواہش، مرضی، آرزو، یا مفاد کے تابع نہ ہو۔۔ اور (۲) ہر ایک اس قانون کا اتباع کرے۔ خارجی کائنات کا نظام اسی پروگرام کے مطابق چل رہا ہے۔ اس میں جو قانون کارفرما ہے وہ نہ تو اشیائے کائنات کا اپنا پیدا کردہ ہے اور نہ ہی کسی کی خواہش کے مطابق اس میں تبدیلی ہوسکتی ہے اور دوسرے یہ کہ ہر شے اس قانون کے مطابق چلنے پر مجبور ہے۔۔ و (ہم) لا یستکبرون۔ (۲۱/۱۹)

جہاں تک انسانوں کی تمدنی دنیا کا تعلق ہے‘ اس کے لئے بھی اسی خدا نے قوانین مقرر کر دیئے ہیں جس نے اشیائے کائنات کے لئے قوانین مرتب کئے ہیں۔ لیکن انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں ایک بنیادی فرق ہے (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) اشیائے کائنات‘ متعلقہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور پیدا کی گئی ہیں‘ لیکن انسان کو اس باب میں صاحب اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے۔ مشیت چاہتی یہ ہے کہ جو کچھ اشیائے کائنات مجبوراً کرتی ہیں‘ انسان وہی کچھ (یعنی قوانین خداوندی کا اتباع) اپنے اختیار و ارادے سے کرے‘ کہ اسی سے اس کی ذات کی نشوونما اور شرف انسانیت کی بالیدگی ہوتی ہے۔

لیکن انسان اپنے اختیار و ارادے کا استعمال غلط کرتا ہے اور اسی سے وہ تمام فساد پیدا ہوتا ہے‘ جو اس کی زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے۔ یہ اپنے لئے آپ قوانین وضع کرتا ہے اور پھر تماشا یہ کہ ان قوانین کا بھی کما حقہٗ اتباع نہیں کرتا۔ ان سے بچنے کے لئے گریز کی ہزار راہیں نکالتا اور لاکھ حربے تراشتا ہے۔۔ انسان کی یہی وہ ذہنیت (اور روش) ہے‘ جسے قرآن کریم نے قصہ آدم کے تمثیلی انداز میں بایں حسن و خوبی بیان کیا ہے۔ ملائکہ اس جدید مخلوق کے ہیولائے آب و گل کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ اتجعل فیھا من یفسد فیھا و یسفک الدماء (۲/۳۰) اسے بااختیار بنایا جا رہا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ زمین میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا۔۔ کہا کہ ٹھیک ہے۔ اگر اسے اعلیٰ حالہٖ چھوڑ دیا گیا تو یہ ایسا ہی کرے گا۔ لیکن ہم اسے خود قوانین زندگی دیں گے۔۔ (فاما یاتینکم منی ھدیً) یہ اگر ان قوانین کا اتباع کرے گا تو پھر یہ حالت نہیں ہوگی۔۔ فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ (۲/۳۸) جو ان قوانین کا اتباع کرے گا تو ایسے لوگوں کو نہ خوف ہوگا نہ حزن‘ ان کی تمدنی زندگی فساد انگیزیوں سے مامون اور خون ریزیوں سے مصئون رہے گی۔ اس کا نام اصلاح ہے اور اس کی خلاف ورزی کا نتیجہ فساد۔۔ اسی لئے تاکید کی گئی کہ۔۔ ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا ۔۔ جب تمہاری تمدنی زندگی بہ حالت اصلاح ہو تو اس میں فساد مت پیدا کرو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ۔ وادعوہ خوفاً وطمعاً (۷/۵۶) رفع مضرت مقصود ہو‘ یا جلب منفعت (کسی کے نقصان سے بچنا چاہو‘ یا کوئی فائدہ حاصل کرنا۔ دونوں صورتوں میں) قانون خداوندی کو آواز دیا کرو‘ اور اس کے مطابق قدم اٹھایا کرو۔ تمہاری زندگی فساد سے محفوظ ہو جائے گی۔ اس کے برعکس اگر تم نے اس اصول حیات سے انکار کیا اور اس سے سرکشی برتی۔۔ خود بھی سرکشی برتی اور دوسروں کو بھی اس راستے پر چلنے سے روکا‘ تو اس سے اس قسم کا فساد پیدا ہو جائے گا جس کی تباہیاں بڑھتی چلی جائیں گی۔ (۱۶/۸۷)

☆☆☆☆☆☆☆

ان اصولی ہدایات کے بعد قرآن کریم نے محسوس انداز میں بتایا کہ انسانوں کی تمدنی زندگی میں فساد کس کس شکل میں رونما ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس نے فساد ملوکیت کو نمایاں طور پر پیش کیا جس کی نمائندگی دنیا کا ہر فرعون کرتا ہے۔ ملوکیت سے مراد ہے ایسا نظام مملکت جس میں انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کی جائے (خواہ اس کی عملی شکل‘۔۔۔ جلال پادشاہی ہو‘ یا جمہوری تماشا)۔ مفاد ملوکیت کا پہلا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسانی وحدت کو ختم کر کے‘ انہیں مختلف گروہوں میں بانٹ دیا جائے۔۔ و یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل و یفسدون فی الارض۔ (۱۳/۲۵) جس انسانی برادری کو ملا کر رکھنے کا حکم خدا

نے دیا تھا وہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور اس طرح زمین میں فساد برپا کر دیتے ہیں۔۔اس کی بدترین شکل' عصر حاضر کی قومیت پرستی (نیشنلزم) ہے جس نے (محض نقشوں پر کھینچی ہوئی فرضی اور غیر فطری لکیروں کے مطابق) عالمگیر انسانیت کو اس طرح مختلف گروہوں میں بانٹ رکھا ہے کہ ایک گروہ' دوسرے گروہ کے خون کا پیاسا' اور ایک قوم دوسری قوم کی جان کی دشمن بن رہی ہے۔اس سے اگلا قدم' ایک قوم کے اندر مختلف پارٹیاں بنانا ہے۔قرآن کریم نے فرعون کے خلاف جو سب سے بڑا جرم عائد کیا ہے' وہ یہی ہے کہ وہ قوم (بنی اسرائیل) کو پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا تھا۔۔ ان فرعون علا فی الارض۔۔ فرعون نے ملک میں بڑی سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔۔اس نے ادھم مچا رکھا تھا۔وجعل اھلھا شیعاً۔یعنی اس نے ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔۔اس پارٹی بازی سے اس کا مقصد کیا تھا؟ یہ کہ یستضعف طائفۃ منھم۔۔وہ اس طرح اس گروہ کو جس سے اسے ذرا خطرہ محسوس ہوتا تھا' کمزور کر دیتا تھا۔اس کی عملی شکل یہ تھی کہ یذبح ابناء ھم و یستحی نساء ھم۔اس پارٹی کے ان افراد کو جن میں جوہر مردانگی کی نمود ہوتی' ذلیل وخوار کر دیتا اور ''زنخوں'' کو آگے بڑھاتا چلا جاتا۔انہ کان من المفسدین (۲۸/۶)۔۔یہ تھی اس کی فساد انگیزی' جس سے اس نے معاشرہ میں اس قدر ناہمواریاں پیدا کر رکھیں تھیں۔

اور یہ چیز کسی خاص فرعونی حاکم کے ساتھ مخصوص نہیں تھی' یہ ملوکانہ حکمت عملی ہے' جو ہر زمانے میں اسی طرح کارفرما رہتی ہے۔ چنانچہ سورہ نمل میں' اس حقیقت کو (ملکہ سبا کی زبانی) ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ

ان الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها و جعلوا اعزة اهلها اذلة۔ وكذالك يفعلون۔ (۲۷/۳۴)

یاد رکھو! جب بادشاہ کسی ملک پر چڑھائی کرتے ہیں تو اسے الٹ پلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔یعنی وہاں کے صاحب عزت اکابرین کو سب سے زیادہ ذلیل وخوار بنا دیتے ہیں اور یہ بات کسی خاص بادشاہ سے متعلق نہیں' ملوکیت میں یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور یہی کچھ ہوتا رہے گا۔

ملوکیت کی ہستی کا راز ہی اس میں ہے کہ قوم مختلف پارٹیوں میں بٹی رہے' اور اس میں ایسا اتار چڑھاؤ ہوتا رہے کہ کبھی ایک گروہ اوپر آ جائے اور کبھی دوسرا۔۔اور اس عمل دولابی میں نکتہ یہ پیش نظر رہے کہ جس فرد یا گروہ میں کہیں جوہر انسانیت کے آثار محسوس ہوں' اسے کچل کر رکھ دیا جائے اور اپنے گرد و پیش انہیں رکھا جائے جن میں ابھرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔ یہ تھی فساد آدمیت کی وہ اولین لعنت جسے مٹانے کے لئے آسمانی انقلاب کے داعی (حضرات انبیاء کرامؑ) دنیا میں آتے رہے۔۔۔اور یہی تھی ان کی وہ انقلابی دعوت' جسے ملوکیت کے علمبردار ''فساد'' سے تعبیر کر کے' کچل دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب صاحبِ ضرب کلیم' حضرت موسیٰؑ نے اس حکمت فرعونی کے خلاف آواز بلند کی تو فرعون کے درباریوں نے اس سے کہا کہ۔۔اتذر موسیٰ و قومہ لیفسدوا فی الارض۔ (۷/۱۲۷)۔''کیا تو موسیٰؑ اور اس کی قوم کو اس طرح آزاد چھوڑ دینا چاہتا ہے کہ وہ ملک میں فساد برپا کر دیں۔''

آپ نے غور فرمایا۔ کہ ملوکیت کے نمائندگان کے نزدیک ''اصلاح'' کا تصور کیا ہوتا ہے اور ''فساد'' سے مراد کیا؟ ہر مستبد قوت' معاشرہ میں صحیح اصلاح کو فساد سے تعبیر کر کے' اس کے

داعیان کو حوالہ دار و رسن کر دینا چاہتی ہے۔ یہ ارباب اقتدار کا گروہ ہوتا ہے، جسے اس قسم کے صحیح انقلاب میں، اپنی مفاد پرستیوں کی موت نظر آتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ جب حضرت صالحؑ نے، قوم ثمود کی فساد انگیزیوں کے خلاف، (جن کی تفصیل ذرا آگے چل کر آئے گی) اعلان احتجاج کیا تو اس قوم کے ارباب اقتدار کو خطرہ محسوس ہوا۔ ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔

وکان فی المدینۃ تسعۃ رھط یفسدون فی الارض ولا یصلحون (۲۷/۴۸)

دارالسلطنت میں صرف نو بڑے بڑے سردار تھے، جن کے ہاتھ میں زمام اقتدار تھی۔ وہی ان تمام شرارتوں کی جڑ تھے وہ ملک میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے تھے اور قوم کو کبھی اصلاح کی طرف نہیں آنے دیتے تھے۔

چنانچہ

انہوں نے اپنی میٹنگ بلائی اور آپس میں کہا کہ قسم اٹھاؤ کہ ہم سب مل کر صالحؑ اور اس کے ساتھیوں پر رات کے وقت حملہ کریں گے اور پھر ان کے ورثاء کے سامنے صاف مکر جائیں گے اور کہہ دیں گے کہ ہم نے انہیں قتل ہوتے دیکھا تک نہیں اور ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔ (۲۷/۴۹)

☆☆☆☆☆☆☆

یہ تھی فساد آدمیت کی پہلی شکل۔۔۔۔ یعنی بساطِ ملوکیت کی مہرہ بازیاں۔۔ اس کی دوسری شکل، معاشی ناہمواریاں ہیں جن کا ذکر قرآن کریم نے بڑی شرح وبسط سے کیا ہے۔ اس نے قصہ آدم کے (تمثیلی انداز) میں، اس ''جنت کی زندگی'' کے متعلق، جس میں ہنوز فساد پیدا نہیں ہوا تھا، کہا کہ اس میں کیفیت یہ تھی کہ وکلا منھا رغداً حیث شئتما۔ (۲/۳۵)۔۔ ہر ایک کو، ہر جگہ، سیر ہو کر کھانے کو ملتا تھا۔۔ اس میں کسی فرد کو، نہ بھوک کا خوف ستاتا تھا، نہ پیاس کا''۔۔ نہ لباس کی محتاجی تھی نہ مکان کی'' (۱۱۹۔۲۰/۱۱۸)۔۔ یہ تھی معاشرہ کی وہ حالت جسے فساد نے نہیں چھوا تھا۔ اس کے بعد، حقیقت فراموش انسان کی مفاد پرستی نے اس میں فساد پیدا کر دیا تو معاشرہ کی یہ حالت باقی نہ رہی۔ مصلحین انسانیت، حضرات انبیاء کرامؑ آتے رہے، تاکہ معاشرہ کو پھر سے انہی خطوط پر متشکل کریں۔ وہ قوم سے کہتے یہ تھے کہ۔

کلوا۔ واشربوا من رزق اللہ ولا تعثوا فی الارض مفسدین (۲/۶۰)

خدا نے جس قدر سامانِ زیست عطا کیا ہے، اس میں سے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق کھاؤ پیو۔ اور زمین میں فساد مت برپا کرو۔۔ معاشرہ میں ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔

قرآن کریم نے جن اقوام کی سرگذشت بیان کی ہے، ان میں سے، قوم ثمود نے اسی قسم کی معاشی ناہمواریاں شدید طور پر پیدا کر لی تھیں۔ اس زمانے کی معیشت، گلہ بانی پر مبنی تھی۔ قوم کے ذی قوت طبقہ نے، ملک کی چراگاہوں اور چشموں پر اس طرح قبضہ کر رکھا تھا کہ کمزوروں اور غریبوں کے مویشیوں کو نہ کھانے کو چارہ ملتا تھا، نہ پینے کو پانی۔۔ حضرت صالحؑ اس ''فساد'' میں ''اصلاح'' پیدا کرنے کے لئے اٹھے۔ انہوں نے ان مستبد سرداروں سے کہا کہ۔۔

فاذکروا آلاء اللہ ولا تعثوا فی الارض مفسدین۔ (۷/۷۴)۔۔ خدا نے تمہیں جن نعماء سے نوازا ہے،

انہیں پیش نظر رکھو اور ملک میں فساد برپا نہ کرو۔۔ معاشی ہمواریاں پیدا کرو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تمام مویشیوں کی باری باندھ لو۔۔ خواہ وہ غریبوں کے مویشی ہوں اور خواہ امیروں کے' رزق کی ضرورت تو ہر مویشی کو ہوتی ہے۔ ان کی ضروریات پوری ہونے دو۔

قوم مدین کا معاشی نظام' کاروباری تھا اور انہوں نے اس میں بھی فساد پیدا کر رکھا تھا۔ اس فساد کی تشریح' حضرت شعیبؑ کے الفاظ میں یوں بیان ہوئی ہے۔ انہوں نے قوم سے کہا کہ

فاوفوا الکیل و المیزان ولا تبخسوا الناس اشیآء ھم ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا۔ (۷/۸۵)

(تمہیں چاہئے' کہ اپنے معاشی نظام میں عدل سے کام لو) ماپ تول کو پورا رکھو۔ لوگوں کے حقوق و واجبات میں کمی نہ کرو' اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد' ناہمواریاں مت پیدا کرو۔

قرآن کریم نے مختلف مقامات پر' قوم مدین کی اس فساد انگیزی کا ذکر کیا ہے اور ہر مقام پر اسے انہی الفاظ سے تعبیر کیا ہے (مثلاً ۸۵/۱۱' ۱۸۵۔۱۸۴/۶۲)۔۔ ''ماپ تول پورا رکھنے'' سے مراد اتنا ہی نہیں کہ ترازو اور باٹ صحیح صحیح رکھو۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ اپنے معاشی نظام کو عدل کی بنیادوں پر استوار کرو۔

معاشی فساد کی بنیاد سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے۔ قرآن کریم نے قارون کو اس ذہنیت کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سورہ قصص میں اس کی ''فساد انگیزی'' کی تفصیل ان الفاظ میں آئی ہے۔

قارون' قوم موسیٰؑ ہی کا ایک فرد تھا' کوئی غیر نہیں تھا۔ لیکن اپنی دولت کے بل بوتے پر اپنی قوم کے افراد سے بڑی زیادتی کرتا تھا۔ چنانچہ اس طرح اس کے پاس اس قدر دولت جمع ہو گئی' کہ اس کے خزانے کی حفاظت کے لئے ایک طاقتور جماعت کی ضرورت تھی۔ اس دولت کے نشہ نے اسے مدہوش کر دیا تھا۔ چنانچہ اس کی قوم کے ہوشمند طبقہ نے اس سے کہا کہ تم اس مال و دولت پر اس قدر اتراؤ نہیں' اس کا نتیجہ خراب ہوگا۔ یہ روش' قانون خداوندی کی رو سے پسندیدہ نہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ تم مال و دولت کو تیاگ کر تارک الدنیا بن جاؤ۔ ہرگز نہیں۔ ہم کہتے یہ ہیں کہ تم اس سے بھی فائدہ اٹھاؤ۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش مت کرو کہ زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی نہیں جس میں انسان کا منتہائے نگاہ مال و دولت جمع کرنا ہے اور بس! زندگی اس سے آگے بھی چلتی ہے۔ اس مال و دولت سے تم اس زندگی کو بھی خوشگوار بناؤ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح خدا نے تمہاری ہر کمی کو پورا کر کے تمہاری زندگی کو حسین بنا دیا ہے' اسی طرح تم دوسروں کی کمی کو پورا کر کے ان کی زندگی کو بھی حسین بنا دو۔ اور معاشرہ میں فساد (ناہمواریاں) مت پیدا کرو (کہ تم امیر سے امیر تر ہوتے جاؤ' اور دوسرے لوگ غریب سے غریب تر ہوتے جائیں۔ اسی کو فساد کہتے ہیں) اور فساد پیدا کرنے والوں کو خدا کبھی پسند نہیں کرتا۔

یہ سن کر اس نے ان سے کہا کہ تمہیں میرے معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ یہ دولت میں نے اپنی ہنرمندی اور چابک دستی سے کمائی ہے' اس لئے جس طرح میرا جی چاہے' صرف کروں۔ اس میں خدا کا کیا دخل ہے اور کسی کو مجھ سے باز پرس کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟

اے کاش! اسے معلوم ہوتا کہ اس قسم کی ذہنیت نے اس

سے پہلے کتنی قوموں کو تباہ کر دیا تھا جو اس سے زیادہ قوت وحشمت کی مالک تھیں' اور انہوں نے مال و دولت بھی اس سے کہیں زیادہ جمع کر رکھا تھا۔ خدا کے قانون مکافات نے انہیں تباہ کر دیا۔ ان کے یہ جرائم اس قدر بدیہی اور نمایاں تھے کہ اس کی بھی ضرورت نہ پڑی کہ ان کے متعلق کچھ پوچھ گچھ کی جائے۔ (نظام سرمایہ داری کی تو بنیاد میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی تباہی کہیں خارج سے نہیں آیا کرتی۔) (مفہوم القرآن ۷۰۔۷۶/۲۸)

اور فساد کا یہی تباہ کن انجام ہے جس کی طرف قرآن کریم نے بار بار توجہ دلائی ہے۔۔ کہیں عمومی حیثیت سے' اور کہیں فساد انگیز قوموں کی تباہی کا خصوصی ذکر کر کے۔۔ عمومی طور پر کہا کہ

الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ۔ زدنھم عذابا فوق العذاب بما کانوا یفسدون۔ (۱۶/۸۸)

جو لوگ اس صداقت سے خود بھی انکار کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس طرف آنے نہیں دیتے' ان کی تباہیاں دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ اس فساد کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ جسے وہ معاشرہ میں برپا کرتے ہیں۔

سورہ بقرہ میں' اس روش کے حاملین کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ۔۔ اولٰئک ھم الخاسرون۔ (۲/۲۷) ان لوگوں کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ سورہ یونس میں کہا کہ۔۔ ان اللہ لا یصلح عمل المفسدین (۱۰/۸۱)۔ یہ یقینی بات ہے کہ خدا کے قانون مکافات کی رو سے' ایسا ہو نہیں سکتا' کہ معاشرہ میں فساد پیدا کرنے والوں کے کام سنور جائیں۔ یعنی معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہو جائے اور جو لوگ اس بگاڑ کے ذمہ دار ہوں' ان کی حالت سنورتی جائے' یہ ناممکن ہے۔ حالت انہی کی سنورے گی جو معاشرہ کو سنوارنے کی کوشش کریں گے۔ سورہ ص میں ہے۔

ام نجعل الذین امنوا وعملو الصلحت کا المفسدین فی الارض..... (۲۸/۳۸)

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ جو قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور معاشرہ کو سنوارنے والے کام کریں' وہ اور وہ لوگ جو معاشرہ میں فساد پیدا کریں' دونوں برابر ہو جائیں؟ ایسا ہو نہیں سکتا۔

اس اصول محکم کی تبئین کے لئے اس نے کہا کہ تاریخ کے اوراق پر غور کرو اور دیکھو کہ جن اقوام نے اس قسم کی روش اختیار کی تھی' ان کا انجام کیا ہوا؟۔۔ وانظروا کیف کان عاقبة المفسدین۔ (۸۶/۷) عاد اور ثمود اور فرعون (وغیرہ) نے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کیں۔۔ فصب علیھم ربک سوط عذاب۔ (۸۹/۱۳) تو خدا کے قانون مکافات نے انہیں بری طرح سے تباہ کر دیا۔

یہ تباہی اس وقت آتی ہے جب معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے کی روش عام ہو جائے اور جو لوگ اس پوزیشن میں ہوں کہ اس غلط روش کا سدباب کر سکیں وہ بھی لوگوں کو اس سے روکنے کی کوشش نہ کریں۔۔ چنانچہ اقوام سابقہ کی سرگزشت بیان کرنے کے بعد' قرآن کریم نے کہا کہ ان اقوام میں سے جو لوگ تباہی سے بچ جاتے تھے' ان میں سے بھی بعد میں' معدودے چند ایسے رہ جاتے جو

اپنے مفاد کو خدا کے قانون کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور ملک میں لوگوں کو ناہمواریاں پیدا کرنے سے روکتے' ورنہ باقیوں کا حال تو یہ ہو جاتا کہ وہ قوانین خداوندی سے سرکشی برت کر' اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لے جاتے' تاکہ ان کی آسودگیوں اور تن آسانیوں میں فرق نہ آنے پائے (خواہ باقی مخلوق پر کچھ ہی کیوں نہ گزرے' یہ تھے ان کے جرائم جن کی وجہ سے ان پر تباہی آتی تھی۔ (مفہوم القرآن۔۱۱/۱۱۶)

☆☆☆☆☆☆☆

آپ قرآن کریم کے ان مقامات پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ اس نے فساد آدمیت کی جو جو شقیں بتائی ہیں' کیا وہ ہمارے معاشرے میں جمع نہیں ہو رہیں؟ اور اگر یہ حقیقت ہے تو کیا اس انداز معاشرت کا حتمی اور یقینی نتیجہ وہی نہیں ہوگا۔ جو اقوام سابقہ کے ہاں ہوا تھا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری حالت اس وقت بعینہ ویسی ہی ہو چکی ہے جیسی قوم مدین کی تھی۔ اس قوم کے متعلق جو کچھ قرآن کریم نے کہا ہے وہ ہر قلب حساس کے لئے سامان صد ہزار عبرت اپنے اندر رکھتا ہے۔ سورہ ھود میں ہے۔

اور اسی طرح ہم نے قوم مدین کی طرف' ان کے بھائی بند' شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے ان سے کہا کہ تم (اپنے آئین و رسوم کو چھوڑ کر) صرف خدا کے قوانین کی اطاعت اختیار کر لو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت تو تم بڑے خوش حال ہو' لیکن تم نے اپنے معاشرہ میں سخت ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس حالت کو بدلو۔ اپنے ناپ تول کے پیمانوں کو پورا رکھو۔ ہر ایک کو اس کا پورا پورا حق دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو مجھے خطرہ ہے کہ تم پر ایسی تباہی آ جائے گی جو تم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

اے میری قوم کے لوگو! اپنے معاشی نظام کی بنیاد عدل و انصاف پر رکھو اور کسی کے حق میں کمی نہ کرو۔ ایسا کرو گے تو ملک میں سخت ناہمواریاں (فساد) پیدا ہو جائیں گی اور معاشرہ تہس نہس ہو جائے گا۔

یاد رکھو! جو کچھ تم اس طرح فریب کاری اور سلب و نہب سے اکٹھا کر لیتے ہو' اگرچہ وہ بظاہر بہت کچھ نظر آتا ہے لیکن وہ تمہارے لئے قطعاً نفع بخش نہیں ہو سکتا۔ ثبات و دوام صرف ان مفادات کے لئے ہے جو قوانین خداوندی کے مطابق حاصل کئے جائیں۔۔ اور خدا کا قانون یہ ہے کہ ثبات و دوام اسے حاصل ہو سکتا ہے جو نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں اس وقت آ سکتی ہے جب تم خدا کے قانون کی صداقت کو تسلیم کرو۔ اگر تم اسے تسلیم نہیں کرتے' تو تم سے اسے جبراً نہیں منوایا جا سکتا۔ میرا کام تم تک اس پیغام کو پہنچا دینا تھا۔ میں تم پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا جو تم سے جبراً یہ کچھ منواؤں۔ (مفہوم القرآن ۱۱/۸۴۔۸۶)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں اس سے زیادہ اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جب تک قوم۔ خدا کے قانون مکافات عمل پر ایمان نہیں لاتی۔۔ یعنی اسے ایک حقیقت کے طور پر تسلیم نہیں کرتی۔۔ اس کی حالت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔۔ اور جب تک یہ اپنی موجودہ روش میں تبدیلی پیدا نہیں کرتی' یہ تباہی سے بچ نہیں سکتی۔ یہ خدا کا قانون ہے۔

ولن تجد لسنة الله تبديلا۔
اور خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منکرین حدیث

(از رسالہ جامعہ دہلی، ستمبر ۱۹۳۱ء)

جب سے حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی، اسی وقت سے اہل علم کی ایک جماعت ایسی ہوتی چلی آئی، جو اس کی دینی حیثیت کی منکر رہی، یعنی ان کے انکار کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حدیث کے وجود یا اس کی حقیقت ہی کو نہیں مانتے یا اس کو بالکل جھوٹ جانتے ہیں، بلکہ صرف یہ کہ اس کو دینی حجت نہیں تسلیم کرتے۔ دین خالص ان کے نزدیک سوائے قرآن کریم کے اور کچھ نہیں۔ حدیث کو وہ صرف دینی تاریخ قرار دیتے ہیں، جس سے عہد رسالت اور زمانہ صحابہؓ میں قرآن پر عمل کرنے کی کیفیت معلوم ہوتی ہے اور بس۔

امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ متوفی ۲۰۴ھ نے اپنی کتاب الام کی ساتویں جلد میں اس جماعت کا ذکر کیا ہے، بلکہ ان میں سے ایک کے ساتھ اپنی بحث کا بھی حال لکھا ہے۔ اس نے امام موصوف سے سوال کیا جو مختصراً یہ تھا:

''قرآن میں جو فرائض مسلمانوں پر عاید کئے گئے ہیں۔ ان میں سے تم کسی کو عام قرار دیتے ہو، کسی کو خاص اور کسی کو فرض اور کسی کو صرف مباح اور یہ سب کچھ ان روایات کی بنیاد پر کرتے ہو جو ان لوگوں سے مروی ہیں، جن میں سے اکثر کو نہ تم نے دیکھا نہ ان سے ملے اور باوجود اس کے کہ ان رواۃ حدیث میں سے جن کی عدالت اور ثقاہت تمہارے نزدیک مسلم ہے۔ تم کسی کی نسبت یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ وہ غلطی، غلط فہمی، خطا اور نسیان سے بھی بری ہیں، پھر بھی ان کی روایتوں کو اس قدر برحق سمجھتے ہو کہ کتاب الہیٰ کے احکام اور فرائض میں ان کے ذریعے سے تفریق کر ڈالتے ہو''۔

امام صاحب نے اس کا جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان روایات سے سنت کی خبر صادق ہم تک پہنچتی ہے اور سنت وہی ہے، جس کو قرآن نے ''الحکمہ'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

لقد من اللہ علی المومنین اذا بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلوا علیھم ایتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب و الحکمۃ۔ (۳/۱۶۴)

مومنوں پر اللہ نے احسان کیا جو ان کے اندر انہیں میں سے ایک رسول کھڑا کیا جو ان کو اللہ کی آیتیں سناتا، ان کا تزکیہ کرتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

دوسری آیت ہے:

ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا۔ (۵۹/۸)

رسول جو تم کو دے وہ لو اور جس سے روکے اس سے باز رہو۔

اس سے سنت کی دینی حیثیت ثابت ہے۔ امام صاحب لکھتے ہیں کہ یہ سن کر اس منکر نے اپنے قول سے رجوع کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دلیلوں سے اس منکر کے قائل کر دینے کو ہم امام شافعی کی کرامت ہی سمجھتے ہیں ورنہ ان سے تو اس کے سوال کے کسی حصہ کا بھی جواب نہیں ہوا۔ کیوں کہ اس کا اعتراض نفس روایت اور ذریعہ خبر کے متعلق تھا کہ مشتبہ ہے، اس لیے قرآن کی غیر مشتبہ آیات میں فیصلہ کرنے کے قابل نہیں۔ علاوہ بریں

''الحکمۃ'' سے جوانہوں نے سنت مراد لی ہے' کسی طرح صحیح نہیں۔ حکمت قرآن میں شامل اور منزل من اللہ ہے' جیسا کہ دوسری آیات میں جابجا تصریح ہے:

وانزل اللہ علیک الکتب والحکمۃ۔ (۴/۱۱۳)

اور اللہ نے تیرے اوپر کتاب اور حکمت نازل کی۔

سورہ بنی اسرائیل میں توریت کے احکام عشرہ کے مقابل احکام سیزدہ گانہ نازل کرنے کے بعد اللہ فرماتا ہے:

ذلک مما اوحی الیک ربک من الحکمۃ۔ (۱۷/۳۹)

یہ اس حکمت (دانش مندی) کی باتوں میں سے ہے' جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہے۔

خود اس منکر نے اعتراض کیا تھا کہ

واذکرن ما یتلی فی بیوتکن من ایات اللہ والحکمۃ۔ (۳۳/۳۴)

تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت جو تلاوت کی جاتی ہیں ان کو یاد کرو۔

سے معلوم ہوا کہ ''الحکمۃ'' بھی قرآن ہی ہے ورنہ سنت کی کون تلاوت کرتا ہے' مگر باوجود اس کے شافعی جیسے امام نے جو ائمہ مذاہب میں نہایت ذہین اور قرآن کے ماہر تھے توجہ نہ کی اور اپنی ہی تفسیر پر مصر رہے' حالانکہ ان کا خود قول ہے کہ سنت منزل من اللہ نہیں ہے بلکہ استنباطات نبویہ کا نام ہے۔ پھر جب الحکمۃ کا قرآن سے منزل من اللہ ہونا ثابت ہے تو وہ سنت کیسے ہوسکتی ہے؟

دوسری آیت ''ما اتاکم الرسول'' مال فئے کی تقسیم کے متعلق ہے' اس کو سنت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

امام شافعی کی ان دونوں دلیلوں کو نجدی اور اہل حدیث علماء آج تک سنت کے ثبوت میں پیش کیا کرتے ہیں اور کبھی یہ غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ان آیات کا اصل مفہوم کیا ہے :

شیخ طاہر جزائری نے بھی اپنی کتاب توجیہ النظر الی اصول الاثر میں منکرین کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

وقد ثبت توقف کثیر من الصحابۃ فی قبول کثیر من الاخبار وقد استدل بذلک من یقول بعدم الاعتماد علیھا فی الدین۔

بہت سی حدیثوں کے قبول کرنے میں بہت سے صحابہؓ کا توقف کرنا ثابت ہو چکا ہے۔ اس سے وہ لوگ دلیل پکڑتے ہیں جو دین میں حدیثوں پر اعتماد نہ کرنے کے قائل ہیں۔

الغرض منکرین حدیث کی ایک جماعت اسلام میں رہی ہے' مگر ان کا کوئی جداگانہ فرقہ کبھی نہ تھا' بلکہ یہ ارباب فکر میں سے وہ لوگ تھے جو غور کرتے کرتے اس حقیقت تک پہنچ گئے کہ حدیثیں دینی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اصل دین قرآن ہی ہے۔

ان منکرین کے اقوال وافکار کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور ان کے دلائل و براہین دیکھے ہیں' جو اس کثرت سے ہیں کہ ان کے لکھنے کے لیے ایک ضخیم دفتر درکار ہے' اس لیے میں ان کی جملہ فروعی باتوں کو چھوڑ کر صرف سات اصولی دلائل اپنے الفاظ میں اختصار کے ساتھ لکھتا ہوں۔

قائلین حدیث کو ان کا جواب یا حدیث کی دینی حیثیت کا ثبوت قرآن ہی سے دینا چاہئے' کیوں کہ وہی فریقین کی مسلم کتاب ہے جو آیات سند میں لکھی جائیں' ان کی تفسیر بھی آیات ہی سے ہونی چاہئے نہ کہ روایات سے۔

(۱) گذشتہ رسولوں کی امتوں کو اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتاب ہی پر ایمان رکھنے کا حکم دیا تھا اور مسلمانوں کو بھی یہی حکم دیا ہے:

قولوا آمنا باللہ وما انزل الینا (۲/۱۳۶)

کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر جو ہماری طرف اتاری گئی۔

امن الرسول بما انزل الیه من ربه والمومنون۔ (۲/۲۸۵)

رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس پر اس کے رب کی طرف سے اتاری گئی اور مومنین بھی۔

وقل امنت بما انزل الله من کتاب (۴۲/۱۵)

اور کہہ دے کہ میں ایمان لایا اس پر جو اللہ نے اتارا' یعنی کتاب۔

اس کثرت سے آیات ہیں جن کا شمار مشکل ہے اور سارے قرآن میں شروع سے آخر تک کتاب اللہ کے سوا کسی سنت اور کسی حدیث پر ایمان رکھنے کا مطلق حکم نہیں ہے' بلکہ ممانعت نکلتی ہے۔

ومن الناس من یشتری لهو الحدیث لیضل عن سبیل الله بغیر علم و یتخذها هزواً اولئک لهم عذاب مهین۔ (۳۱/۶)

بعض آدمی وہ ہیں جو حدیث کے مشغلہ کے خریدار ہوتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں بلاعلم (یقین) کے اور اس کو مذاق بنالیں۔ یہ لوگ ہیں جن کے لیے خوار کرنے والا عذاب ہے۔

اس آیت میں ''لہوالحدیث'' کے لفظ کی تفسیر ائمہ حدیث نے غنا کی ہے' یعنی گانا اور اس کی روایت حضرت ابن عباس تک پہنچائی ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ پھر اللہ کو غناء کہنے میں کیا دشواری تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تفسیر کسی طرح صحیح نہیں۔ کیوں کہ اس آیت میں لہوالحدیث کی دو صفتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ لوگوں کو گم راہ کرنے والی ہے۔ دوسری یہ کہ اس کی بنیاد علم پر نہیں ہے۔ غناء کی غرض نشاط وطرب ہے۔ اس کا مقصد نہ گم راہ کرنا ہے نہ اللہ کی راہ کو مذاق بنانا ہے اور نہ اس کو علم یعنی یقین یا غیر یقین سے کوئی تعلق ہے۔ یہ صرف قصص اور روایات ہی ہیں جو لہوالحدیث ہیں۔

کہا گیا ہے کہ رسول پر بھی تو ایمان لانے کا حکم قرآن میں ہے' اس لیے اس کے اقوال واعمال جن کا نام حدیث ہے' خود بخود جزو ایمان بن گئے۔ جواب دیا گیا ہے کہ بے شک ہمارے رسول بلکہ جملہ رسولوں پر ایمان لانا فرض ہے۔

لا نفرق بین احد من رسله۔ (۲/۲۸۶)

اللہ کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان بھی ہم فرق نہیں کرتے (ایمان لانے میں)۔

مگر ساری بحث تو یہی ہے کہ رسول کا پیغام امت کے لیے قرآن ہے یا حدیث۔ رسول پر قرآن نازل کیا گیا۔ اسی کی تلاوت۔ اسی کی تبلیغ اور اسی کی تعلیم کا حکم دیا گیا۔ رسول نے اسی کو سنایا' اسی کو لکھوایا' اسی کو یاد کرایا اور اسی پر عمل کیا۔ اس کے اتارنے والے نے اس کی حفاظت کا بھی ذمہ لے لیا۔ کیا حدیثوں کے لیے ان میں سے کوئی ایک بات بھی تم ثابت کر سکتے ہو؟ حدیثوں کی کیفیت تو یہ ہے کہ جس نے جو دیکھا یا سنا اس کو بیان کرنا شروع کر دیا۔ یہی باتیں سلسلہ بہ سلسلہ امت میں پھیلیں اور ایک ایک سچ میں سو سو جھوٹ شامل ہو گیا۔ ایک زمانہ کے بعد تم نے اصول مقرر کر کے ان میں سے کسی کو قابل تسلیم قرار دیا اور کسی کو مسترد کر دیا۔ کیا جن حدیثوں کو تم نے تسلیم کیا ہے ان کے اوپر کوئی آسمانی مہر ہے یا خود رسول اللہ کے سامنے پیش کر کے ان کی تصدیق کرالی گئی ہے؟ پھر کس طرح ان کو جزو ایمان یا واجب التسلیم کہنے کا حق رکھتے ہو' درآں حالیکہ وہ اصول بھی جن کے اوپر حدیث کی صحت کا دارومدار تم نے رکھا ہے یقینی صحت کی ضمانت سے قاصر ہیں۔ رسول اللہ نے صرف قرآن ہی پر عمل کیا ہے اور بحیثیت رسالت وہی امت کے لیے ان کا پیغام ہے:

واوحی الی هذا القران لا نذرکم به ومن

بلغ۔ (۶/۲۰)

مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا کہ اس سے تم کو آگاہ کروں اور ان کو بھی جن تک یہ پہنچے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اطاعت رسول قرآن میں مامور بہ ہے:

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول۔ (۴/۵۹)

اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اور امیروں کی جو تم میں سے ہوں۔ اگر کسی معاملے میں تم آپس میں جھگڑ بیٹھو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔

اور جب اطاعت رسولؐ فرض ہے تو لازم ہے کہ اس کے اقوال و اعمال جمع کیے جائیں تاکہ امت اس کی اطاعت کرے۔

اگر یہ استدلال صحیح ہے تو اسلام میں جس قدر امر ا ہوئے ہیں، ان میں سے بھی ہر ایک کا ایک ایک مجموعہ احادیث ہونا چاہئے، ورنہ ان کی اطاعت کیسے ہوگی، کیوں کہ ایک ہی لفظ "اطیعوا" ہے، جس میں رسول اور امراء دونوں داخل کیے گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رسولؐ کی اطاعت، باذن الٰہی اور بحیثیت منصب رسالت فرض ہے، جیسا کہ اللہ نے کہا ہے:

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ (۴/۶۴)

ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لیے کہ باذن الٰہی اس کی اطاعت کی جائے۔

بلکہ چونکہ رسول اللہ ہی کا پیغام لاتے ہیں اور اسی کی اطاعت چاہتے ہیں، اس لیے ان کی اطاعت اور اللہ کی اطاعت ایک ہی ہوتی ہے۔

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (۴/۸۰)

جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

لیکن اطاعت رسول سے عملی اور بالمشافہ اطاعت مراد ہے۔ اسکے لیے دفاتر تیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم میں اس کی تصریح ہے:

یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و رسولہ ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون۔ (۸/۲۰)

اے مومنو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو جب کہ تم سن رہے ہو۔

یہ سوال کہ رسول کے بعد کس طرح اس کی اطاعت ہوگی، اولوالامر کی اطاعت کے حکم سے حل ہو جاتا ہے جو اس کی جانشینی کریں گے۔

آیت کے دوسرے ٹکڑے یعنی بصورت تنازع معاملہ کو رسول کی طرف رد کرنے کے حکم سے حدیث کے بعض حامی اس کی دینی حیثیت کا ثبوت پیش کرتے ہیں، لیکن انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس صورت میں رسول کو کیا کرنے کا حکم ہے۔ سنئے:

فاحکم بینھم بما انزل اللہ۔ (۵/۴۸)

ان کے درمیان قرآن کے مطابق فیصلہ کر۔

انا انزلنا الیک الکتب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ۔ (۴/۱۰۶)

ہم نے تیری طرف قرآن اتارا حق کے ساتھ کہ جو اللہ تجھ کو سمجھائے، اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کر۔

دراصل حکم کتاب اللہ ہی ہے۔ رسول یا امیر اسی سے اپنی فہم کے مطابق فیصلہ کرنے پر مامور ہیں۔ اسی لیے فرمایا:

وما اختلفتم فی شئی فحکمہ' الی اللہ (۴۲/۱۰)

اگر تم کسی بات میں اختلاف کرو تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے۔

اللہ کے فیصلہ کے معنی یہ ہیں کہ اس کی کتاب کی رو سے فیصلہ کیا جائے۔

افغیر اللہ ابتغی حکما وھو الذی انزل الیکم الکتب مفصلا۔ (۶/۱۱۵)

کیا اللہ کے ماسوا کوئی حکم تلاش کروں اور وہ تو وہ ہے جس نے تمہاری طرف مفصل کتاب اتار دی۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفاسقون۔ (۵/۴۸)

جو اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ فاسق ہیں۔

(۲) اتباع کے متعلق اللہ تعالیٰ کا قطعی حکم یہ ہے:

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء۔ (۳/۷)

اس کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کے یہاں سے اتارا گیا اور اسکے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔

اس آیت میں حصر ہے کہ قرآن ہی کی پیروی کرو اور اس کے سوا کسی دوسرے کی پیروی نہ کرو۔ درحقیقت یہ آیت اس امر میں نص صریح ہے کہ بجز کتاب اللہ کے کسی کی پیروی جائز نہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ اسی قرآن میں رسولؐ کی اتباع کا بھی حکم دیا گیا ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی۔ (۳/۳۱)

کہہ دے کہ اگر تم کو اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو۔

لیکن خود رسولؐ کو کس کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے؟ اس کی بھی تصریح قرآن میں ہے:

اتبع ما اوحی الیک من ربک (۶/۱۰۶)

پیروی کر اس کی جو تیرے رب کے پاس سے تیری طرف وحی کی گئی۔

پھر رسولؐ کو اعلان کر دینے کا حکم دیا جاتا ہے:

قل انما اتبع ما یوحی الی من ربی (۷/۲۰۳)

رب کے پاس سے میری طرف وحی آتی ہے۔

لہٰذا رسولؐ بجز وحی کے کسی چیز کا پیرو نہیں تھا' اس لیے اس کی پیروی بعینہ قرآن کی پیروی ہے۔

یہ خیال کہ رسولؐ اللہ کی زبان مبارک سے جو کچھ نکلتا تھا' سب وحی تھا' جس کے ثبوت میں آیت

ما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی۔ (۵۳/۳۔۴)

وہ نفس کی خواہش سے نہیں بولتا۔ وہ تو صرف وحی ہے جو اس پر بھیجی جاتی ہے۔

پیش کی جاتی ہے صحیح نہیں ہے' کیوں کہ کفار کو جو انکار تھا وہ قرآن کے متعلق تھا' اسی کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ وہ وحی ہے۔ رسولؐ اللہ کی عام گفتگو جو گھر میں یا لوگوں کے ساتھ ہوتی تھی' اس کے متعلق نہ کوئی انکار تھا نہ کوئی بحث تھی چنانچہ دوسری آیات میں تصریح ہے کہ وحی قرآن ہی ہے۔

واوحی الی ھذا القران لا نذرکم بہ ومن بلغ۔ (۶/۱۹)

اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تا کہ میں تم کو اس کے ذریعہ سے آگاہ کروں اور ان کو بھی جن تک وہ پہنچے۔

قل انما انذرکم بالوحی۔ (۲۱/۴۵)

کہہ دے کہ میں تو صرف وحی کے ذریعہ سے آگاہ کرتا ہوں۔

حصر ہے کہ سرمایہ انذار قرآن ہی ہے اور وہی قرآن لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے مجھ پر وحی کیا گیا ہے۔

جو لوگ وحی کی دو قسمیں قرار دیتے ہیں' متلو اور غیر متلو جن میں پہلی کو قرآن اور دوسری کو حدیث کہتے ہیں۔ وہ محض ان کی خیالی تقسیم ہے۔ بعضوں نے وحی کی دو قسمیں خفی اور جلی کی ہیں' لیکن ہمارے رسولؐ کی وحی تو سب خفی تھی۔ وحی کی کیفیت خود قرآن میں کئی جگہ بیان کی گئی ہے:

نزل به الروح الامین علی قلبک (۲۶/۱۹۴)

روح الامین اس کو لے کر تیرے قلب پر اترا ہے۔

(۳) قرآن خالص اور دائمی حق ہے:

ویری الذین اوتو العلم الذی انزل الیک من ربک هو الحق۔ (۳۴/۷)

اور اہل علم جانتے ہیں کہ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر اترا ہے وہی حق ہے۔

یقینی ہے اور ہر قسم کے شک وشبہ سے پاک ہے:

ذلک الکتب لا ریب فیه۔ (۲/۲)

یہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں۔

روح الامین اس کو لاتا ہے اور رسولؐ امین پر اتارتا ہے۔ شہاب ثاقب کے پہرے لگا دیے جاتے ہیں تا کہ کسی قسم کی شیطانی آمیزش نہ ہو سکے۔ چنانچہ وہ جن جنھوں نے قرآن سنا تھا' کہتے ہیں :

کنا نقعد منها مقاعد للسمع فمن یستمع الان یجد له شهابا رصدا۔ (۷۲/۱۰)

ہم بیٹھا کرتے تھے سننے کے ٹھکانوں پر' مگر اب جو سنتا ہے تو شہاب کو اپنی تاک میں پاتا ہے۔

اتارنے کے بعد اللہ تعالیٰ نبی کو اس کے خود پڑھانے اور یاد کرانے کا ذمہ لیتا ہے:

ان علینا جمعه و قرانه' (۷۵/۱۸)

یقیناً ہمارا ذمہ ہے کہ ہم اس کو یاد کرا دیں گے اور پڑھا دیں گے۔

اس بات کی بھی ذمہ داری لیتا ہے کہ یاد کرا دینے کے بعد تم اس کو بھولو گے نہیں۔

ستقرئک فلاتنسیٰ (۸۷/۷)

ہم تمہیں پڑھا دیں گے پھر تم اس کو نہ بھولو گے۔

پھر اس کتاب کی ابد تک حفاظت کرنے کا اعلان کرتا ہے :

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون۔ (۱۵/۱۰)

ہم ہیں کہ ہم نے قرآن اتارا اور ہم ہیں کہ اس کے نگہبان ہیں۔

وہ اس کے لفظ لفظ کا محافظ ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے کلمات کو بدل سکے۔

واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک لا مبدل لکلماته ولن تجد من دونه ملتحدا (۱۸/۲۷)

اور سنا' جو کچھ تیری طرف وحی کی گئی ہے' یعنی اپنے رب کی کتاب۔ کوئی اس کے کلمات کو بدلنے والا نہیں اور اس کے سوا ہرگز تجھے کوئی پناہ نہیں ملے گی۔

اور حدیثیں بجز متواتر (جن حدیثوں کی بابت بعض علماء حدیث نے تواتر لفظی کا دعویٰ کیا ہے ان کی تعداد تین چار سے زائد نہیں۔ ان میں بھی دین کی کوئی اہم بات نہیں ہے اور ان کا تواتر بھی قصداً ظہور میں نہیں آیا' بلکہ اتفاقی ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ ایک حدیث بھی متواتر موجود نہیں) کے جس کے وجود ہی میں بحث ہے باتفاق ائمہ حدیث تمام تر ظنی ہیں۔ امام غزالی لکھتے ہیں:

خبر الواحد لا یفید العلم۔

(المستصفیٰ جز واول ص ۱۴۰)

خبر واحد یقین کا فائدہ نہیں دیتی۔

خبر واحد کی تعریف بھی اسی صفحہ میں ہے:

انا نرید بخبر الواحد فی هذا المقام مالا ینتهی من الاخبار الی حد المتواتر المفید للعلم فما نقله جماعته من

خمسته اوستته مثلا فهو خبر الواحد۔

ہم اس مقام پر خبر واحد سے وہ خبر مراد لیتے ہیں جو حد متواتر تک جو مفید یقین ہے نہ پہنچے مثلاً جس خبر کو ایک جماعت پانچ چھ آدمیوں سے روایت کرے وہ خبر واحد ہے۔

اور اللہ تعالیٰ ظن کا روادار نہیں:

وان تطع اكثر من فى الارض يضلوك عن سبيل الله ان يتبعون الا الظن و ان هم الا يخرصون (۱۱۶/۶)

روئے زمین کے اکثر لوگ ایسے ہی ہیں کہ اگر تو ان کی اطاعت کرے گا تو اللہ کی راہ سے گمراہ کر دیں گے وہ تو صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور صرف اٹکل دوڑاتے ہیں۔

وما يتبع اكثرهم الا ظنا۔ ان الظن لا يغنى من الحق شيئا۔ (۳۶/۱۰)

اکثر ان میں سے نہیں پیروی کرتے مگر ظن کی اور ظن حق کا کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔

ولا تقف ما ليس لك به علم۔ (۳۶/۱۷)

اور اس کے پیچھے نہ چل جس کا تجھ کو علم نہیں۔

اس لیے حدیثیں دینی امور میں کار آمد نہیں۔ صرف تاریخ دین کا کام دے سکتی ہیں۔

(۴) سرچشمہ دین اللہ ہی ہے:

شرع لكم من الدين ما وصى به نوحا والذى اوحينا اليك۔ (۱۳/۴۲)

اللہ نے تمہارے لیے وہی دین مشروع کیا، جس کی وصیت اس نے نوحؑ کو کی تھی اور جس کو ہم نے تیری طرف وحی کیا۔

یعنی اولین رسل حضرت نوح علیہ السلام سے خاتم رسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک وہی دین ہے، جو اللہ نے مشروع کیا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے:

ثم جعلناك على شريعة من الامر فاتبعها۔ (۱۸/۴۵)

پھر ہم نے تجھ کو (عالم) امر[1] کی شریعت پر لگا دیا ہے اس کی اتباع کر۔

[1] عالم امر جس کے ماتحت عالم خلق میں جملہ طبیعی اور حیاتی حرکات کا صدور ہوتا ہے قرآن کی تعلیمات مہمہ میں سے ہے۔ اس کے سمجھ لینے سے عرش، ملائکہ، روح، وحی، دین اور شریعت وغیرہ کے حقائق واضح ہو جاتے ہیں، لیکن یہ مسئلہ بھی دیگر اہم قرآنی مسائل کی طرح مسلمانوں میں محروم توجہ رہا جس کی وجہ سے بہت سے اختلافات پڑے اور نزاعیں واقع ہوئیں۔ من جملہ ان کے فتنہ خلق قرآن تھا، جس میں علماء و صلحاء مصیبت میں ڈالے گئے۔ خاص کر امام احمد ابن حنبل جیسے بزرگ اٹھائیس مہینے تک قید و بند کی سختی جھیلتے رہے۔ اگر اس وقت عالم امر کی حقیقت واضح ہوتی تو فریقین کو اپنی اپنی غلطی کا علم ہو جاتا اور نزاع نہ ہوتی، نہ علماء کو ضرورت پڑتی کہ قرآن کو غیر مخلوق اور قدیم ثابت کرنے کے لیے حدیثیں بنائیں، کیوں کہ اس رسول اعظمؐ و مہبط وحی سے جس کی رسائی افق اعلیٰ تک تھی اور جو اپنی نورانی چشم بصیرت سے صاف دیکھ رہا تھا کہ وحی کا فیضان عالم امر سے ہے جو کہ سراسر حادث ہے، قطعاً ناممکن تھا کہ اس کو قدیم کہہ دے۔ اسی طرح استواء علی العرش کی بحث ہے جو صدیوں رہی بلکہ آج تک ہے اور علماء کی سمجھ میں نہیں آ سکی۔

قرآن اتار کر اس نے اپنے دین کو مکمل کر دیا اور اعلان فرمایا:

يايها الناس قد جاء كم برهان من ربكم وانزلنا اليكم نورا مبينا۔ فاما الذين امنوا بالله واعتصموا به فسيد خلهم فى رحمته منه و فضل ويهديهم اليه صراطا مستقيما۔ (۱۷۵/۵)

لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیل آ گئی اور ہم نے نور مبین تمہاری طرف اتار دیا۔ اب جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور جنہوں نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو وہ ان کو اپنی رحمت اور مہربانی میں داخل کرے گا اور اپنی طرف سیدھے راستہ کی ہدایت دے گا۔

یہی نور مبین یعنی قرآن ہے جس کی روشنی میں نبی خود چلتا تھا اور سب کو چلاتا تھا۔ اسی آفتاب حقیقت نے اس کے افق قلب پر طلوع ہو کر اس کو سراج منیر بنایا تھا۔ یہی اس کا سرمایہ تعلیم و تبلیغ اور سامان بشارت و انذار تھا۔ اسی سے وہ لوگوں کا تزکیہ کرتا' یعنی ان کو کفر و شرک کی ظلمت سے نکال کر اسلام اور صراط مستقیم کی روشنی میں لاتا تھا۔

کتاب انزلناہ الیک لتخرج الناس من الظلمت الی النور۔ (۱۴/۲)

کتاب ہم نے تیری طرف اتار دی ہے کہ تو لوگوں کو تاریکی سے روشنی میں نکال لائے۔

اسی کی تلاوت کرتا' اسی کو سناتا' اسی کو لکھاتا' اسی کو یاد کراتا' اسی کو سکھاتا اور اور اسی پر عمل کر کے امت کے لیے نمونہ قائم کرتا۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ (۳۳/۲۲)

تمہارے لیے رسولؐ اللہ کے اندر اچھا نمونہ ہے۔

چنانچہ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' نکاح و طلاق' جنگ و صلح وغیرہ تقریباً جملہ اوامر و نواہی کتاب پر عمل کر کے طریقہ بتا دیا' جو امت میں نسلاً بعد نسلٍ متواتر متوارث چلا آ رہا ہے۔

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جب تعامل امت جو تواتر کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ تمہارے نزدیک یقینی اور دینی ہے تو پھر حدیثوں کے دین ہونے میں کیا قباحت ہے۔ آخر وہی اعمال تو ہیں جو دفاتر حدیث میں مدون کیے گئے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ دونوں ایک نہیں ہیں بلکہ تعامل اور حدیث میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ تعامل یقینی ہے اور حدیث ظنی ہے۔ تعامل احکام قرآن پر عمل کی صورت ہے اور حدیثیں اس سے دس گنی بلکہ سو گنی باتیں زیادہ شامل رکھتی ہیں اور قرآنی حدود سے آگے بڑھ کر زندگی کے ہر شعبہ میں انسانیت کو ایسے امور کی پابند بناتی ہیں جو صرف ہنگامی یا مقامی ہو سکتے ہیں' مثلاً قرآن نے وضع اور لباس میں انسان کو آزاد چھوڑا ہے اور اسلام جیسے عالم گیر فطرتی دین کو جو ہر ملک اور ہر قوم کو اپنے جھنڈے کے نیچے لانا چاہتا ہے ایسا ہی وسیع ہونا بھی چاہئے' مگر حدیثیں مسلمان کے لیے ایک مخصوص ہیئت اور وضع معین کرتی ہیں۔ انہوں نے بال بال تک جکڑ رکھا ہے کہ اس کو چھوڑو اور اس کو منڈاؤ۔ بعض جگہ وہ قرآن کے بالکل خلاف جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے علماء قطعی اور حکمی آیات کو منسوخ کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً اللہ نے مال دار مسلمان پر مرنے سے پہلے والدین اور اقرباء کے لئے وصیت فرض کی ہے:

کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیراً الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف حقا علی المتقین۔ (۲/۱۸۰)

تمہارے اوپر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آ جائے اور وہ مال چھوڑے تو والدین اور اقرباء کے لیے دستور کے مطابق وصیت کر جائے۔ اہل تقویٰ پر یہ ایک حق ہے۔

مگر حدیث کہتی ہے:

لا وصیۃ لوارث

کسی وارث کے لیے وصیت نہیں۔

علماء نے اس ظنی حدیث کی وجہ سے وہ یقینی وصیت جو اللہ نے بہت سے عائلی مصالح کے لحاظ سے فرض کی ہے اور جس کو اہل تقویٰ پر ایک حق قرار دیا ہے۔ منسوخ کر ڈالی۔

حدیثوں کا تو یہ حال ہے کہ جو روایات قرآن کی تفسیر میں ہیں وہی خود بعض جگہ اس کے برخلاف ہیں۔ مثلاً

ولقد اتینا موسی تسع ایات بینات۔ (۱۰۲/۱۷)

ہم نے موسیٰ کو نو کھلی کھلی نشانیاں دیں۔

اس کی تفسیر حدیث کی زبان سے سنئے:

''صحیح احادیث میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ سامنے سے دو یہودی گذرے۔ ایک نے دوسرے سے کہا ''چلو اس پیغمبر سے کچھ سوال کریں۔ دوسرے نے کہا پیغمبر نہ کہو، سن لے گا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی خوش ہوگا) اس کے بعد وہ آپ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا کہ موسیٰ کو نو آیتیں کون سی دی گئیں۔ آپ نے فرمایا وہ یہ ہیں کہ کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ، زنا نہ کرو، کسی بے گناہ کو قتل نہ کرو، چوری نہ کرو، جادو نہ کرو، کسی حاکم کے پاس بے جرم کی چغلی نہ کھاؤ، سود نہ کھاؤ، کسی پاک دامن پر تہمت نہ لگاؤ، اور میدان جہاد سے نہ بھاگو، اس نویں حکم میں راوی کو شک ہے اور خاص تمہارے لیے اے یہود یہ دسواں حکم ہے کہ سبت کے دن زیادتی نہ کرو۔ (نہ صرف دسواں بلکہ توریت کے احکام عشرہ کل کے کل یہود کے لیے تھے توریت دینے کے بعد حضرت موسیٰ کو اللہ نے حکم دیا وامر قوك یا خذو باحسنہا یعنی اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کو بہترین طریقہ سے لیں۔)

یہ سن کر دونوں یہودیوں نے آپ کے دست و پا کو بوسہ دیا۔

یہ حدیث جامع ترمذی، مسند احمد، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر میں ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو دو جگہ نقل کیا ہے۔ ایک تفسیر بنی اسرائیل میں اور دوسری باب ''ما جاء نی قبلۃ االید والرجل'' اور دونوں جگہ کہا ہے کہ ''حدیث حسن صحیح'' (سیرۃ النبی مجلد سوم، طبع دوم ص ۴۳۱)

حضرت موسیٰ کی تسع آیات کی تفسیر توریت کے احکام تسعہ کے ساتھ جو اس حدیث میں کی گئی ہے، نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں بلکہ قرآن کی رو سے اس کا صحیح ہونا قطعاً محال ہے، کیوں کہ حضرت موسیٰ کو یہ نو نشانیاں اس وقت ملی تھیں، جب مدین سے مصر جاتے ہوئے اللہ نے ان کو رسول بنا کر فرعون کی طرف بھیجا تھا اور اس وقت تک توریت نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔

ان دونوں باتوں کی تصریح قرآن میں موجود ہے۔ خود آیت مذکورہ

ولقد اتینا موسی تسع ایات بینات (فاسئل بنی اسرائیل) اذ جاء ھم فقال لہ فرعون انی لا ظنک یا موسی مسحورا۔ (۱۰۲/۱۷)

موسیٰ کو ہم نے کھلی کھلی نو نشانیاں دیں (تو بنی اسرائیل سے پوچھ لے) جب وہ ان کے پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ میں خیال کرتا ہوں کہ تجھ پر جادو کیا گیا ہے۔

سے ثابت ہے کہ یہ نشانیاں لے کر حضرت موسیٰ فرعون ہی کے پاس گئے تھے۔ مزید تصریح سورۂ نمل میں ہے:

فی تسع ایات الی فرعون و قومہ

نو نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کی طرف۔

سورۂ اعراف میں جہاں حضرت موسیٰ کا قصہ مکمل بیان کیا گیا ہے۔ ان نشانیوں کی تفصیل کر دی گئی ہے:

فالقی عصاہ فاذا ھی ثعبان مبین و نزع یدہ فاذا ھی بیضاء للنظرین (۱۰۸/۷)

موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا وہ کھلا ہوا اژدھا ہو گیا اور اپنا ہاتھ نکالا وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید تھا۔

ولقد اخذنا ال فرعون بالسنین و نقص

من الثمرات۔ (۷/۱۳۰)

آل فرعون کو ہم نے قحط اور پھلوں کی کمی میں گرفتار کیا۔

فارسلنا علیہم الطوفان والجراد والقمل والضفادع والدم ایات مفصلات۔ (۷/۱۳۳)

پھر ہم نے بھیجا طوفان' ٹڈی' چیچڑیاں' مینڈک اور خون الگ الگ نشانیاں۔

اس تفصیل کے مطابق وہ نو نشانیاں جو حضرت موسیٰ کو دی گئی تھیں یہ ہوئیں:

عصا' ید بیضا' قحط' نقص ثمر' طوفان' ٹڈی' جوں' مینڈک' خون۔

اس کے مدتوں بعد فرعونی ہلاک کیے جاتے ہیں اور حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لیے ہوئے طور کی طرف پہنچتے ہیں' وہاں اللہ تعالیٰ ان کو توریت عطا کرتا ہے:

یا موسی انی اصطفیتک علی الناس برسلتی وبکلامی فخذما اتیتک وکن من الشاکرین وکتبنا لہ فی الالواح من کل شئی موعظۃ و تفصیلا لکل شئی۔ (۷/۱۴۴۔۱۴۵)

اے موسیٰ! میں نے تجھ کو لوگوں پر اپنی پیغمبری اور کلام کے لیے چن لیا' جو میں تجھ کو دیتا ہوں لے اور شکر ادا کر اور ہم نے اس کے لیے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر شے کی تفصیل لکھ دی۔

یہ تمام تفصیلات اس قدر مصرح ہیں کہ ان میں نہ کسی شک کی گنجائش ہے نہ کسی تاویل کی' مگر پھر بھی ان کے خلاف یہ ''چار آنکھوں والی'' حدیث جو صحاح ستہ کی ہے بتلاتی ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسع آیات کی تفسیر توریت کے احکام تسعہ کے ساتھ کی۔ کوئی عقل اس کو تسلیم کر سکتی ہے؟ چنانچہ بعض مفسرین نے باوجود حدیث مذکورہ کے بھی یہ تفسیر قبول نہیں کی۔ اسی پر یہ معاملہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ چوں کہ ان یہودیوں نے خوش ہو کر آں حضرتؐ کے دست و پا کو بوسہ دیا تھا' اس لیے حدیث میں ایک باب ''قبلتہ الید والرجل'' کا اور اضافہ ہو جاتا ہے جس سے علماء کے ہاتھ پاؤں چومنے کا جواز نکالا جاتا ہے۔ اس روایت سے کئی باتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ارباب صحاح ستہ نے جو شرطیں حدیث کی صحت کے لیے مقرر کی ہیں وہ کس حد تک اس کی ضمانت کرتی ہیں۔

(۲) ان ائمہ کے حسن و صحیح کہنے کی قدر و قیمت کیا ہے۔

(۳) جو لوگ ایسی حدیثوں پر ایمان رکھنے کو دین اور قرآن جیسے آسمانی نور اور جاودانی حق کے خالص دین ماننے کو الحاد و بے دینی قرار دیتے ہیں وہ کہاں تک دین کی حقیقت سے آشنا ہیں۔

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کی حفاظت کی طرف توجہ نہ فرمائی بلکہ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے حکم دے رکھا تھا۔

لا تکتبوا عنی شیئا غیر القران

مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو۔

اگر بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فتح مکہ کے دن کا خطبہ ابوشاہ کو لکھوا دیا' یا کسی خاص صحابی کو لکھنے کی اجازت دے دی تو یہ مستثنیات میں شمار ہوگا۔ عام حکم یہی تھا کہ سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھا جائے اور یہی صحابہ کرامؓ نے سمجھا تھا۔ چنانچہ ابوداؤد کتاب العلم میں ہے:

وفد زید بن ثابت علی معاویۃ فسالہ عن حدیث فامر انسانا ان یکتبہ فقال لہ زید ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرنا ان لا نکتب من حدیثہ فحاہ۔

حضرت زید بن ثابت امیر معاویہ کے پاس گئے تھے۔ انہوں نے ایک حدیث دریافت کی پھر ایک آدمی کو حکم دیا

کہ اس کو لکھ لے۔ زید نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم ان کی حدیث نہ لکھیں۔ اس لیے اس کو مٹا دیا۔

اس سے علماء حدیث کی وہ توجیہ بھی غلط ہو جاتی ہے جو انہوں نے کی ہے کہ ممانعت کتابت حدیث کا حکم صرف اس لیے تھا کہ آیات کے ساتھ مخلوط نہ ہو جائیں۔

بے شک روایات کو بیان کرنے کی اجازت حدیثوں سے نکلتی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضور اکرمؐ روایت کو روایت ہی رکھنا چاہتے تھے اور دین یعنی قرآن کی طرح اس کو محفوظ بنانا پسند نہیں کرتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے عہد میں روایت سے بھی منع کر دیا۔ جب لوگوں کو دیکھا کہ اس میں اختلاف کرتے ہیں تو جمع کر کے فرمایا کہ آج تم اختلاف کرتے ہو، آئندہ لوگ اس سے بھی زیادہ اختلاف کریں گے، اس لیے رسول اللہ ﷺ سے کوئی روایت نہ کرو۔[1] (تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی ترجمہ ابوبکر۔)

انہوں نے خود تقریباً پانچ سو حدیثوں کا ایک مجموعہ بھی لکھ رکھا تھا، اس کو بھی آگ میں جلا دیا۔[2] (تذکرۃ الحفاظ)

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اور بھی زیادہ سختی برتی۔ اگر کوئی روایت کرتا تو درہ لے کر اس کے مارنے کو تیار ہو جاتے اور جب تک گواہ اور شاہد نہ لے لیتے نہ چھوڑتے۔ لکھنے کی مطلق اجازت نہ دیتے۔

عبداللہ بن علاء کہتے ہیں کہ میں نے قاسم بن محمد بن ابوبکرؓ سے کہا کہ مجھ کو حدیث لکھوائے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں حدیثیں زیادہ ہو گئی تھیں، انہوں نے منادی کرائی کہ لوگ حدیثیں ان کے پاس لائیں۔ جب لائے تو حکم دیا کہ ان کو جلا دو۔ پھر فرمایا کہ مثناۃ جیسے اہل کتاب کی مثناۃ۔ علاء کہتے ہیں کہ اس دن سے مجھے قاسم نے روک دیا کہ میں ایک حدیث بھی لکھوں۔ (طبقات ابن سعد، جزء خامس، ص ۱۴۰)[3] (یہود نے انبیاء کی روایات کتاب میں جمع کی تھیں جس کا نام مثناۃ رکھا تھا۔)

حضرت عثمانؓ کے پاس محمد بن علی ایک نوشتہ لے گئے، جس میں نبی ﷺ کا وہ حکم لکھا ہوا تھا، جو زکوٰۃ کے بارے میں تھا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اس سے معاف کرو۔[1] (توجیہ النظر ص ۱۶) حضرت علیؓ سے جب کوئی حدیث بیان کرتا تھا تو اس سے حلف لیتے تھے۔[2] (توجیہ النظر ص ۱۱)۔

حضرت ابن عباسؓ نے بھی حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ''الوضوء مما مسة النار'' اور حضرت علی کی حدیث ''نهى عن المتعه'' اور حضرت ابوسعید خدری کی حدیث قبول کرنے سے انکار کیا۔[3] (توجیہ النظر ص ۱۶)

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے اس طرز عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حدیث کو دین نہیں سمجھتے تھے، ورنہ قرآن کی طرح اس کی بھی حفاظت کرتے۔ بے شک احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین نے شہادت لینے کے بعد روایتیں قبول کی ہیں۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو عینی گواہ مل جاتے تھے جو شہادت دیتے تھے کہ ہم نے اپنے کانوں سے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے اس کو سنا ہے، مگر عہد صحابہؓ کے بعد عینی شہادت کا ملنا ناممکن ہو گیا اور شہادت در شہادت عقلاً عرفاً یا قانوناً کسی لحاظ سے قابل سماعت نہیں۔ ایسی شہادت کی بنیاد پر آپ کسی عدالت سے ایک پیسہ کا بھی فیصلہ اپنے حق میں نہیں لے سکتے۔

(۶) روایت کی صحت کا معیار ائمہ حدیث نے راویوں کی ثقاہت اور عدالت کو قرار دیا ہے۔ حدیث کے جانچنے کا سب سے بڑا ذریعہ ان کے پاس یہی ہے۔ ارباب صحاح ستہ میں سے ہر ایک نے جو شرطیں رکھی ہیں، ان میں جو فرق مراتب ہے وہ رواۃ کی ثقاہت ہی کا ہے۔ امام بخاری صرف اول درجہ کے ثقہ راویوں کی روایت لیتے ہیں۔[1] (امام بخاری نے جب اپنی کتاب صحیح لکھنی شروع کی تو چھ لاکھ حدیثوں میں سے جو ان کے پاس تھیں صرف ۷۲۷۵ شرط کے مطابق ملیں جو انہوں نے درج کیں۔ ان میں سے اگر مکررات نکال دی جائیں تو یہ

تعداد چار ہزار سے بھی کم رہ جاتی ہے۔(مقدمہ صحیح بخاری) امام مسلم کہیں کہیں درجہ دوم والوں کی بھی قبول کر لیتے ہیں۔ارباب سنن ان سے بھی کچھ نرم ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس ثقاہت کو تولنے کی کون سی میزان ہے۔کیا یہی کہ ثقہ لوگ ان کو ثقہ کہیں؟ پھر ان ثقہ کہنے والوں کی ثقاہت کا سوال آتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ثقاہت یا عدالت خود ائمہ حدیث کی تعریف کے مطابق ایک باطنی وصف ہے۔۲؎(عدالت محدثین کے نزدیک وہ ملکہ راسخہ ہے جو عقل، علم، دینداری اور تقویٰ سے پیدا ہو کر جھوٹ سے باز رکھے۔) جس کے اوپر سوائے ظن اور تخمین کے کوئی قطعی شہادت نہیں ہو سکتی، لہٰذا سارا دارومدار حدیث کا شروع سے آخر تک ظن پر ہے۔

رواۃ میں طبقہ اول صحابہ کرامؓ کا ہے۔ائمہ حدیث نے یہ طے کر دیا ہے کہ جملہ صحابہ ثقہ ہیں۔علامہ ابن صلاح کہتے ہیں:

للصحابة باسرهم خصيصة وهى ان لا يسال عن عدالة احدمنهم بل ذلك امر مفروغ عنه۔

(مقدمہ ابن صلاح ص ۱۴۹)

جملہ صحابہ کی ایک خصوصیت ہے اور وہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی کی عدالت کا سوال نہیں اٹھایا جا سکتا۔ بلکہ یہ ایسا امر ہے کہ طے شدہ ہے۔

پھر اسی صفحہ میں ہے:

ان الامة مجمعة على تعديل جميع الصحابة ومن لا بس الفتن منهم كذلك۔

تمام صحابہ کی تعدیل پر امت کا اجماع ہے۔ان میں سے جو فتنوں میں شریک ہوئے وہ بھی ایسے ہی ہیں۔

صحابی کی تعریف بھی انہیں کی زبان سے سن لیجئے:

المعروف من طريقة اهل الحديث ان كل مسلم راٰى رسول الله صلى الله عليه وسلم فهو من الصحابة۔

طریقہ اہل حدیث کے مطابق مشہور یہی ہے کہ ہر مسلم جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا وہ صحابی ہے (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۴۸)

صحابہ کرامؓ کی عظمت و جلالت شان کی وجہ سے ہم اس اصول پر جو غیر صحیح، قرآن کے خلاف اور محض عقیدت مندی کا فیصلہ ہے بحث کرنا پسند نہیں کرتے، لیکن اس امر پر اپنی حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایک طرف تو یہ فیاضی کہ ہر ایک صحابی کو عدالت اور ثقاہت کا پورا پورا حصہ دے دیا جاتا ہے اور دوسری طرف یہ بخل کہ ان کی تعریف میں مومن بھی نہیں صرف مسلم کہا جاتا ہے، حالاں کہ اس عہد کے منافقین بھی جن کی بابت قرآن میں ہے:

ومن اهل المدينة مردوا على النفاق لا تعلمهم نحن نعلمهم۔ (۹/۱۲)

اور کچھ لوگ مدینہ کے نفاق پر اڑے ہوئے ہیں ان کو تم نہیں جانتے، ہم جانتے ہیں۔

مسلمان ہی کہلاتے تھے اور رسولؐ اللہ تک کو ان کے نفاق کا علم نہ تھا۔نیز واقعہ ''افک'' میں جو لوگ شریک تھے، جن پر حد قذف پڑی۔جن کی نسبت قرآن میں حکم دیا گیا ہے:

لا تقبلوا لهم شهادةً ابداً (۲۴/۵)

نہ قبول کرو ان کی کوئی گواہی کبھی۔

وہ بھی مسلمان ہی کہے جاتے تھے۔علاوہ بریں ایک ایک طرف تو یہ روایت کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا:

لا ترجعوا بعدى كفارا يضرب بعضكم رقاب بعض۔

میرے بعد پلٹ کر کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔

دوسری طرف جن لوگوں نے فتنوں میں پڑ کر باہمی لڑائیوں میں ایک دوسرے کا گلا کاٹا' ان کو بھی ابوبکر وعمر کے ساتھ ثقاہت کے پلہ میں ہم وزن رکھ دیا جاتا ہے۔

صحابہؓ کے بعد ہر ہر طبقہ کے رواۃ ایک ایک کر کے جرح و تعدیل کے مسلخ میں لائے جاتے ہیں اور ان کی پوست کشی کی جاتی ہے۔ بہت سے کذاب' خبیث اور دجال وغیرہ قرار دیئے جاتے ہیں اور بہتوں پر مہر توثیق ثبت ہوتی ہے۔ پھر ان ثقاۃ میں سے بھی کمتر ایسے ہیں جو جرح کی تیغ سے زخمی نہ ہوں۔ ایک کو ایک اگر صادق کہتا ہے تو دوسرا اسی کو کاذب بناتا ہے۔!(کوئی خوش قسمتی سے اگر بالکل بے داغ نکل گیا تو تدلیس کے بے پناہ تیروں سے بچنا مشکل تھا بڑے بڑے ائمہ مثلاً حسن بصری' مکحول شامی' سفیان ثوری' مالک بن انس اور دار قطنی وغیرہ اس کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ حافظ ابن مندہ نے تو امام بخاری و مسلم پر بھی وار کیا تھا' مگر علماء حدیث نے بیچ میں پڑ روک لیا۔ (طبقات المدالسین ابن حجر) اور یہ سب کچھ محض ظن' نری تخمین ہے' اللہ نے فرمایا ہے:

قتل الخراصون۔ (۱۰/۵۱)

اٹکل دوڑانے والے مارے پڑے۔

آپ کہیں گے کہ شک کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں' مگر منکرین کو شک کی بیماری نہیں ہے۔ ان کا کہنا تو یہ ہے کہ یہ دین کا راستہ ہی نہیں ہے جو آپ نے اختیار کیا۔ دین کو براہ راست اللہ اپنے نبی پر نازل کر دیتا ہے۔ اس علیم وحکیم نے اپنے بندوں کو اس بات کا محتاج نہیں چھوڑا ہے کہ عقل اور انسانیت کے خلاف پہلے وہ لاکھوں مردہ بزرگوں کو جرح وتعدیل کی بھٹی میں جلا کر کھرا کھوٹا الگ کریں۔!(مذہبی جماعتوں میں ہم خیالی بڑی چیز ہے۔ تعدیل میں زیادہ کارفرما یہی جذبہ تھا۔ ذرا بھی کوئی مخالف نکلا کہ مجروح ہوا' جرح وتعدیل کا منظر بھی ایک مضمون میں بسط کے ساتھ دکھلانے کے قابل ہے۔) پھر دین کا پتہ لگائیں۔ اس نے صاف صاف اعلان کر دیا ہے:

قد جاء کم من اللہ نور و کتاب مبین یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام و یخرجھم من الظلمات الی النور باذنہ و یھدیھم الی صراط مستقیم۔ (۵/۱۶)

لوگو! اللہ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی اور کتاب مبین آ چکی۔ جو لوگ اللہ کی رضا کے پیرو ہیں ان کو اللہ اس کے ذریعہ سے سلامتی کی راہ دکھاتا ہے اور اپنے حکم سے ان کو تاریکی سے روشنی میں نکالتا ہے اور سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

(۷) قرآن اتحاد پیدا کرتا ہے۔ اس کا پیغام ایک۔ اس کی راہ عمل ایک اور اس کی منزل مقصود ایک ہے۔ وہ کوئی فرقہ بنانے نہیں آیا' بلکہ اقوام عالم میں حق کو ذریعہ وحدت بنانا چاہتا ہے۔ اس نے جملہ انبیاء ورسل کی امتوں کو ایک ہی امت قرار دیا ہے:

ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاتقون۔ (۲۳/۱۵۴)

یہ تم سب کی امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں مجھی کو پوجو۔

فرقہ بندی کو وہ کفر وضلالت بلکہ شرک قرار دیتا ہے:

ان الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعا لست منھم فی شئی۔ (۶/۱۵۹)

جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا کر لیا اور گروہ گروہ ہو گئے' ان سے (اے رسولؐ) تجھ کو کوئی واسطہ نہیں۔

ولا تکونوا کا الذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاء تھم البینات اولئک لھم عذاب عظیم۔

ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنہوں نے نشانیوں کے آ جانے کے بعد تفریق ڈالی۔ وہ لوگ تو وہ ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے۔

ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعا کل حزب بما لدیھم فرحون۔ (۳۰/۳۲)

تم مشرک نہ بنو' یعنی وہ جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہ گروہ ہوگئے اور ہر جماعت اسی میں مگن ہے جو اس کے پاس ہے۔

یہ حتمی ہے کہ مسلمانوں میں جو جو فرقے پیدا ہوئے۔ ان کی بنیادیں خاص خاص روایتوں ہی پر تھیں اور آج تک ہیں۔ جملہ مذاہب اسلامی کی بنیادی سندیں جو روایات ہیں' گنائی جاسکتی ہیں بلکہ ان میں سے اکثر فرقہائے اسلامی کے مورخین نے اپنی اپنی کتابوں میں گنائی بھی ہیں۔ علامہ ابن جوزی کے بیان کے مطابق بہت سے فرقوں نے حدیثیں بنا بنا کر اپنے اصول مضبوط کیے ہیں۔ اس لیے روایات تفرق وتشتت کا موجب ہوئیں جن سے امت کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔ اگر قرآن پر جملہ اختلافات کا فیصلہ رکھا جاتا تو یقیناً کوئی تفریق نہیں ہوسکتی تھی۔ ہر چند کہ انسانوں میں اختلاف ہمیشہ رہے گا۔

لا یزالون مختلفین الا من رحم ربک۔
(۱۱/۱۱۹)

ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے مگر وہ جن پر تیرا رب مہربانی کرے۔

مگر ہمارا مقصد جملہ بنی نوع انسان سے نہیں بلکہ ''من رحم ربک'' یعنی اہل حق اور مسلمانوں سے ہے کہ ان میں وحدت قائم رہتی۔

کہا جاسکتا ہے کہ حدیثوں کے دین نہ ماننے پر بھی فہم قرآن میں اختلافات ممکن ہیں' اس لیے پھر بھی فرقے پیدا ہوسکتے ہیں۔ بے شک فہم معانی میں اختلافات ہوں گے' لیکن ان کے اوپر فرقہ کی تعمیر نہ ہوسکے گی' کیوں کہ قرآن کی حقیقت ایک' تعلیم ایک' مفہوم ایک اور غرض اور منتہائے نظر ایک ہے۔ جو شخص کسی مسئلہ میں کوئی رائے قائم کرے گا علمائے قرآن کے مسلسل غور وفکر کے بعد اگر وہ صحیح ثابت ہوگی تو تسلیم کر لی جائے گی' ورنہ مسترد بجنسہٖ اسی طرح جس طرح اس عالم مادی میں علماء طبیعی وغیرہ الگ الگ نظریے قائم کرتے ہیں' پھر ایک مدت تک غور وفکر کرتے کرتے ان پر اس کی صحت یا غلطی نمایاں ہوجاتی ہے۔ قرآن میں کامل صلاحیت اس بات کی موجود ہے کہ جملہ اختلافات کا قطعی فیصلہ کر سکے' وہ کتاب ''مفصل'' اور ''تبیاناً لکل شئی'' ہے۔

یہ تو علمی پہلو ہے اور عملی پہلو سے تو قرآنی جمہوریت اس قدر وسیع اور روشن ہے کہ اس میں سوائے وحدت کے تفریق ہو ہی نہیں سکتی۔ اسلام کا ابتدائی عہد یعنی قرن اول جس میں نہ حدیثیں مدون ہوئی تھیں نہ انہوں نے دینی حیثیت حاصل کی تھی' خالص عمل بالقرآن کا دور تھا' جس نے ہر لحاظ سے اس کو خیر القرون بنا دیا تھا۔ تفرقے اسی وقت سے پیدا ہوئے' جب سے روایت اور شخصیت پرستی آئی۔

کہا جاتا ہے کہ حدیثوں کو تمام امت نے شرق سے غرب تک دینی حجت تسلیم کر لیا۔ پھر اس میں تمہارے لیے بحث کی گنجائش کہاں رہی۔ جواب یہ ہے کہ تمہارے نزدیک چار دلیلیں ہیں۔ کتاب' سنت' اجماع اور قیاس۔ اور اسی ترتیب سے ان کے مدارج ہیں۔ کیا تم حدیث کو جو بلند تر حجت ہے' اجماع سے جو فروتر حجت ہے ثابت کرنا چاہتے ہو' یعنی اپنے مشعل کو چراغ کی روشنی سے دکھانا چاہتے ہو۔ اگر ایسا ہے تو تمہارا مشعل تاریک ہے۔ اجماع سارے عالم کے نزدیک صرف ایک ہنگامی چیز ہے۔ یہ مسلمانوں کی خصوصیت ہے کہ انہوں نے اس کو دینی حجت اور دائمی حق بنا رکھا ہے۔

ان دلائل کے علاوہ منکرین حدیث نے ان مضر اثرات اور نتائج پر بھی بسط کے ساتھ بحثیں کی ہیں جو روایت پرستی سے پیدا ہوئے ہیں اور اس سے بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ انہوں نے حدیث کی بے اعتباری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے' مگر میں نے اس مضمون میں ان باتوں کو قصداً چھوڑ دیا کیوں کہ موضوع بحث یعنی حدیثوں کے دینی حجت ہونے یا نہ ہونے سے ان کو زیادہ تعلق نہیں۔

A RELIGIOUS DIVINE SPEAKS

Approach to Quran

Story of Quranic interpretation

==========

Translation Of Extracts From Preface To The First Edition Of The Tarjuman Al-Qur'an, 1930

While taking up this work, *The Tarjuman al-Qur'an,* for study one may be disposed to know the lines which I have adopted in the presentation therein of the contents and objective of the *Qur'an*. Indeed, anticipating such a wish on the part of my readers, I had contemplated to state the lines followed in a brief preface to the volume. But when I set out to deal with the subject, I soon realized that it was not possible to do justice to it within the brief compass of a preface. The issues involved were so many and so complicated that a satisfactory discussion of them would have necessitated a detailed survey of a very wide and intricate background. The idea was therefore given up. Instead, I have attempted here to draw just a passing attention to the difficulties or obstacles which usually clog the way of a satisfactory study of the *Qur'an* so that the reader may incidentally obtain a rough idea of at least the purposes underlying the attempt made here to present the *Qur'an* to the world of today.

As for the exposition of the principles followed in the presentation of the commentary, one will have to await the publication of my *Prolegomena* to the Commentary in the rewriting of which I am at present engaged.

For various reasons into which one may not go here, the exact message of the *Qur'an* has for centuries been steadily kept out of view; so much so, that a very low standard of approach to it has come into vogue. This is noticeable not merely in the approach to the Qur'anic content but to almost everything connected with it—its language and idiom, its phrase structure, and its style.

In every age, the author of a work is normally the product of his intellectual environment. It is only those who are gifted with vision and insight who form the exception. When we look back into the history of the commentaries of the *Qur'an* from the earliest centuries of Islam right up to the close of the last century, we find that the standard of approach to the meaning of the *Qur'an* and steadily deteriorated. This was

the result of a gradual decadence in the quality of the Muslim mind itself. When the commentators found that they could not rise to the heights of the Qur'anic thought, they strove to bring it down to the level of their own mind.

If we are to see the *Qur'an* in its true light, it will be necessary for us to lift all those veils which have, from age to age, been laid thereon under the stress of influences alien to the spirit of the *Qur'an* and then search for the reality about it in its own pages.

Obstacles in the Way of Right Appreciation

These influences are by no means few. They are numerous, and have pervaded every corner of Islamic thought. It is not, therefore, easy to set them out on a brief canvas. I have, however, tried in my *Prolegomena* to the commentary of the *Qur'an* to sum them up under certain broad heads. The following are the leading aspects which call for consideration:

(1) The *Qur'an* is not bound by any conventionality in its form of presentation or style or in its manner of address or argument, but follows a way of expression such as is germane to the character of its content or is natural to it. It is this distinctive peculiarity observed by all scriptures which distinguishes them from the conventional forms of literary expression employed in learned discussions.

The first generation of people among whom the *Qur'an* was delivered were not a sophisticated race. Their mind was not cast in any artificial or conventional mould furnished by civilization. It was content to receive a simple thought in its plain simplicity. That was why the Qur'anic thought, simple as it was, sank easily into their hearts. No one at the time felt it difficult to catch its meaning. The moment the companions of the Prophet heard a verse recited to them, they forthwith caught its significance.

But hardly had the first generation of Muslims passed away when the influences of the Roman and Iranian civilizations began to sweep over the new Arab empire. Translations from the Greek literature gave them new literary tastes and initiated them into the art of dialectics. Zest for novelty and inventiveness in approach to everything came to be ever on the increase, with the result that the simplicity of the Qur'anic manner gradually lost its charm for them. Slowly, step by step, a stage was reached when everything Qur'anic was attempted to be given an artificial mould. Since the Qur'anic thought could not fit into any such mould, serious complications in thought arose, with every attempt at resolving them ending in more intricate

complications.

Whenever distance is assumed from naturalness, and artificiality resorted to, we are disinclined to look at things in their natural simplicity. We cannot visualize beauty or grandeur in its simplicity. Whenever we choose to endow a thing with splendor, we invariably try to fix it in a network of ornamentation. This is what exactly happened with the *Qur'an*. The dispositions of the first generation of Muslims were not cast in any conventional or artificial moulds. That was why they instantly caught the meaning of the *Qur'an*. But the generations which followed would not let the *Qur'an* present itself in its simplicity. Their love for inventiveness or novelty would not allow this. They began to dress everything in the *Qur'an* in novel costumes; and since the *Qur'an* could not fit into such costumes, the effort to force on it things which did not suit it repressed its genius and forced its meaning to assume forms by no means natural to it.

The first period of the Qur'anic interpretation was that which preceded the codification of Islamic learning. The second began with this codification and has continued, in its different phases, through the succeeding centuries. The second period had hardly opened when the urge to cloak the *Qur'an* in new garbs took its rise reaching its climax during the heyday of philosophic speculation among Muslims. That was the time when Imam Fakhruddin Razi wrote his Commentary to invest the Qur'anic word with an absolutely novel import. Had Imam Razi chosen to represent what exactly the *Qur'an* stood for, at least two-thirds of what he wrote would have been left unwritten.

Be that as it may, one thing stands out clearly, and it is that to the extent the *Qur'an* is freed from the unnatural moulds into which it is pressed, to that extent will it disclose its own reality. The difficulties which we feel today in appreciating the manner of presentation observed by the *Qur'an,* or the arrangement of its parts and verses, or the phraseology employed therein are all due to the inclination inherited from our mediaeval past not to appreciate a simple thing for its simplicity. The *Qur'an* is so simple to understand and yet we do not feel happy until we evaluate its worth by fanciful standards of our own making, standards so distasteful to the purposes of the *Qur'an*. That is the picture which today confronts us at every turn.

(2) Whenever we are to know what meaning a particular piece of writing bears, we naturally prefer to accept the meaning given to it by those who have had the opportunity of ascertaining it from one who originally published it. The *Qur'an*, be it remembered, was delivered piecemeal during the course of 23 years. Whatever portion

of it was delivered was raptly listened to by the companions of the Prophet and was repeatedly recited in their prayers; and whatever clarification they needed of anything therein, they obtained it directly from the Prophet himself. Of these companions, some were distinguished for the firm grasp they had of the Qur'anic meaning, and this is endorsed by the Prophet himself. It should have been in the fitness of things to have given preference to their interpretation over the interpretation of those who came after them who had not the advantage of close association with the Prophet. It is a matter for regret that those who came after the first generation chiefly inspired by external influences, began to invent for themselves new and newer forms of approach to the *Qur'an* and caused the original interpretation of it to fall into disuse. The idea came to be entertained that "the earlier generation was strong in faith, and the later generation was strong in knowledge," although the earlier generation was reputed to be sound both in heart and mind, in faith as well as in knowledge. All the same, the real meaning of the *Qur'an* was gradually relegated to the limbo of oblivion, and its simple message came to raise, in almost every sphere of life, issues too difficult to solve.

To make matters worse, an unwarranted attitude was assumed which hardened as time went. This led to complications which in their turn necessitated the employment in their support of a variety of methods of argument. And then came into vogue the habit of textual criticism, the writing of foot-notes, and indices. This again gave rise to further complications in the approach to the meaning of the *Qur'an*. In certain cases, it laid layers above layers of veils over it, one thicker than the other.

To understand the situation, take any passage of the *Qur'an* for illustration. First, look into the interpretation of it which the companions of the Prophet and the first generation of Muslims gave to it. Then turn to the commentaries of those who came after, and compare the two. The earliest commentaries present the Qur'anic meaning in its natural simplicity, whereas the later commentaries gave to it a strange visage by making it the subject of subtle disquisitions.

(3) From the very beginning, stories and anecdotes from the lore of new converts to Islam steadily received currency in Muslim circles. A great body of them were of Jewish origin, and exerted a powerful influence on the Muslim mind. The early commentators avoided to make use of them. But the anecdotes nevertheless succeeded in forcing themselves into the very texture of the commentaries of the *Qur'an* written after them.

(4) The traditions of the Prophet were usually employed to clarify the meaning of

the *Qur'an*. But the tendency among the later commentators grew apace to refer not so much to the traditions known to the companions of the Prophet, but to those collected indifferently in later times. This created further difficulties in the understanding of the Qur'anic word.

(5) The sad result of all this was that the manner of presentation adopted by the *Qur'an* was lost in a maze of far-fetched conceits. The strength of the Qur'anic meaning lies in the manner of its presentation. It is that which lends clarity to its statements and observations, and makes significant the import of its stories and parables, its appeals and admonitions, and its purposes. Once the significance of this manner was missed, the true picture of the *Qur'an* was lost to sight. In the words of a poet:

"The very page was blackened
Whereon had been noted what was desired."

The manner of argument observed by the Prophets was not to assume logical poses and confuse the hearer. They adopted the natural way of direct appeal, such as might reach every type of mind, and touch every heart. But the commentators, obsessed by the philosophy and logic of Greece could hardly bring themselves to look at reality in its naturalness and appreciate it: They thought that they were honouring their Prophet by turning them into dialecticians. They sought to demonstrate the greatness of the *Qur'an* by pressing it into the framework of Aristotelian logic, hardly realizing that it was never its primary object. The result was that the beauty and attraction of the Qur'anic method of argument and of demonstrating its truth was lost in a network of dialectical disquisitions. In fact, the truth had already been lost. The tragedy was that our commentators could not achieve even what they aimed at. They simply let the door wide open to doubt and endless speculation. Imam Razi showed the greatest alacrity and ingenuity in promoting this consummation.

(6) The trouble did not end here. The application of philosophy to the Qur'anic thought gave rise to numerous dialectical terms, with the result that the simple words of Arabic came to be invested with new connotations. The subject of the *Qur'an*, it is obvious, is not the philosophy of the Greeks, nor was the Arabic language at the advent of the *Qur'an* familiar with its philosophic terms. The words employed in the *Qur'an* did not originally bear the meaning which was assigned to them in the light of Greek concepts. The transformation led to a variety of speculations; so much so, that words such as *Khulud, Ahdiyat, Mithliyat, Tafsil, Hujjat, Burhan* and *Tawil* came to bear meanings which the earliest listeners of the *Qur'an* would never have thought could

bear.

(7) As a corollary to this attitude, the idea came to the fore that the *Qur'an* should support and endorse every new discovery in scientific knowledge. An attempt, therefore, was made to read therein an argument in favour of the Polemic system even as the present-day dispensers of intelligence who write commentaries of the *Qur'an* try to interpret it in terms of every new development in the Science of the Cosmos.

(8) Every book or every system of teaching has something or other for its central theme; so much so that everything pertaining to it revolves round it; and unless this central theme or its primary objective is understood, its significance or anything that is subsidiary to it is not possible properly to comprehend. The *Qur'an* has certain fundamental objectives to present. Unless these are appreciated in their proper perspective, nothing pertaining to them is possible to catch aright. When under the circumstances explained above, the essential objectives of the *Qur'an* were missed, it was but inevitable that everything pertaining to them could not be viewed in proper perspective—the statements of the *Qur'an*, its teaching, its method of argument and of address, and its remarks and observations. Space does not allow citation of illustrations here. Still, to catch a fleeting glimpse of what has been wrought by our commentators, attention may be drawn to but one or two examples. Take verse 160 of chapter 3: "It is not meet for a prophet to act dishonestly," and read the far-fetched commentaries thereon. Take another verse which reproduces the Jewish assertion—"The hand of Allah is tied up" (5:64). What a rambling, do we not find in the explanations given thereof in utter disregard of the context in which the verse occurs!

(9) A primary condition of proper appreciation of the Qur'anic meaning is the presence in the commentator of a right taste for literature. But for various reasons this taste steadily grew weaker among our commentators, resulting in inept approaches to the Qur'anic word or to the idiom and usage of the language in which the *Qur'an* had been delivered.

(10) The field of interpretation of the Qur'anic word has always been affected, even as the fields of arts and sciences, by the atmospheric influence of every preceding age. It is no doubt a matter for pride that in the course of Muslim history, scholars possessed of upright character never yielded to political influences or tolerated compromises in the doctrinal beliefs of Islam. But the atmospheric influence of an age does not penetrate through the door of politics alone. In its psychological aspects, it finds for itself many a door to come in. Once such doors are thrown open, they scarcely close there-after, however much one might try. The doctrinal beliefs might escape contamination, and thanks to our upright scholars they indeed were not seriously

touched. But the general character of the minds of men could not remain unaffected.

(11) The period of enquiry and research in Islamic learning came to an end after the close of the 4th century of the Hijra, and thereafter, barring certain exceptions, the tendency to lean on the past for every idea took hold of the mind of the learned. Every one who ever attempted to write a commentary of the *Qur'an* chose as a matter of course to have before him the work of some predecessor and to follow it blindly in every detail. If, for instance, a commentator of the third century had committed a serious blunder in the understanding of any particular passage in the *Qur'an*, it became the bounden duty of those who came after him to reproduce word by word whatever he had written. No one for a moment paused to scrutinize the statement or question it. The result was that gradually few could develop the urge to write fresh commentaries. Every one contented himself there-after to write only marginal notes to the commentaries already in existence. Read the marginal notes of Baidavi and Jalalain and see what energy was wasted by them to give more coatings to the walls already raised by others.

(12) The prevailing ineptitude of scholars in the succeeding periods of Muslim history let every form of idiosyncrasy to prosper; so much so, that only those commentaries came into fashion and were read with zest which bore no trace whatever of the touch given to the interpretation of the *Qur'an* by the earliest band of commentators. The tendency grew universal. It was felt in every sphere of learning. The period of time which could prefer Sakkaki to Jurjani or prefer Taftazani to Sakkaki was indeed a period when only writers of the type of Baidavi and Jalalain could shine.

(13) Take the case of compilations wherein matter was gathered from commentaries already in existence. Wherever a variety of interpretations had been offered by previous commentators, the compiler would invariably choose the feeblest. Not that his eyes did not rest on appropriate or valid interpretations; but with a view to pandering to the prevailing taste, he would deliberately overlook them.

(14) To make matters worse, the type of commentary known as "Tafsir-bir-rai" or commentary which lets the text sub-serve one's own personal opinion on any subject, came now freely to be written—a form of commentary strongly discountenanced by the companions of the Prophet. Not that reason and insight were tabooed in *Islam*. Were it so, all study of the Qur'anic thought would seem futile; for the *Qur'an* openly invites its readers to exercise reason in their approach to it, and ponder on what it states. At every corner of its presentation, it exclaims:

"Do they meditate on the *Qur'an?*
Or, are there locks on their minds?" (Q:47:24)

"Tafsir-bir-rai" is that form of commentary which does not aim to represent what the *Qur'an* actually states. On the other hand, the commentator has some view to advance and he presses the Qur'anic text to lend support to it.

This style of commentary came into vogue in the days when every doctrinal belief of Islam came to be seriously examined and a number of schools of theology took their rise, each intent on exploiting the *Qur'an* to uphold its own point of view. Commentaries written with this purpose are styled "Tafsir-bir-rai".

Further, when zealous followers of the different juristic schools among Muslims developed the passion for sectarianism, the verses of the *Qur'an* were exploited to uphold, by book or by crook, their own particular schismatic obsessions. Few cared to be guided by the plain meaning of the plain word of the *Qur'an*, or by the clear purposes underlying the Qur'anic method of presentation of its contents, or by straight-forward reason. Every one attempted to force the Qur'anic meaning to conform to the views sponsored by the Imam or founder of his own schismatic school of thought.

To create further complications, certain sections of the Sufi school of thought in their search for the hidden meaning of the *Qur'an*, went so far as to press everything Qur'anic into the moulds of their own formulas. Thus every Qur'anic injunction and every basic belief came to bear some sort of esoteric connotation. This form of approach is also "Tafsir-bir-rai".

Or take another instance of this "Tafsir-bir-rai". Attempts were made during the period under reference to give the Qur'anic method of argument the garb of Greek logic. In fact, whenever any reference was made to the sky, or the constellary order, attempt was made to square it with the Greek system of astronomy.

Or take the latest examples of interpretation attempted by a certain type of commentators both in India and Egypt in the name of reorientation of the Qur'anic thought. Attempt is made to invoke the *Qur'an* to lend its support to the achievements of modern research in the different spheres of scientific thought, as if the *Qur'an* was delivered over 1,300 years ago just to endorse in advance, in the form of riddles, what centuries after, men like Copernicus, Newton, Darwin, H. G. Wells, could find out for themselves without the aid of any revealed scripture—riddles reserved to be noticed and unraveled only by the present-day Muslim commentators of the *Qur'an*. Such commentaries are also to be classed as "Tafsir-bir-rai".

Such in brief is the story of the Qur'anic interpretation attempted in the past. But however brief this survey, it is enough to show what obstacles one has to overcome to reach the *Qur'an*, or what thick veils to lift to catch a clear vision of it. The effort will

involve a simultaneous survey of every nook and corner of the *Qur'an* and the exercise of deep insight into the meaning of things. It is only then that the forsaken reality of the *Qur'an* may put in its appearance. I have tried to the best of my ability to negotiate with these obstacles. I cannot say to what extent I have succeeded in my attempt. But I may say this with confidence that I have opened a new avenue for an intelligent approach to the *Qur'an*, and hope that men of understanding will notice that the method adopted by me is something fundamentally different from the method pursued in the past.

Abul Kalam

****